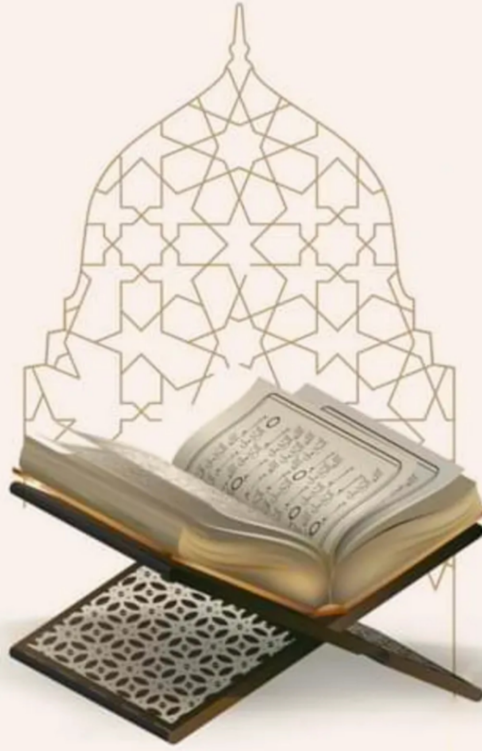


اسلامی فکر کیا ہے

ایک تنقیدی جائزہ

مولانا عبد العلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ الاقصی





اسلامی فکر کیا ہے؟

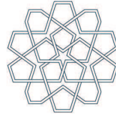
ایک تنقیدی جائزہ

(۱۹۹۶ء)



مولانا عبد العلیم اصلاحیؒ

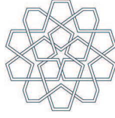
فہرستِ مضامین



صفحہ نمبر	عناوین	نمبر شمار



تمہید



اس وقت پوری دنیا میں حتیٰ کہ تہذیب جدید کے اصل مراکز میں بھی اسلام پسندی اور اسلامی تحریک صرف زندہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ پیر مارتی ہوئی نظر آتی ہے مخالف کیمپ انتہائی مضبوط موقف میں ہے اعلیٰ عصری ذرائع و وسائل اور اسلحہ کے ساتھ لیس ہے اس کے باوجود جرأتِ رندانہ اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا جانا حیرت انگیز ہے اس کی چھوٹی سی مثال امریکہ کے صعوبت خانہ میں ایک نابینا عالم شیخ عبدالرحمن کی موجودگی ہے یہ معمولی واقعہ نہیں ہے کہ آنکھوں سے معذور ایک شخص دنیا کی سپر طاقت کے مدمقابل ڈٹا ہوا ہے۔

سہ روزہ ''دعوت'' لکھتا ہے:

''دنیا کی واحد سپر طاقت''۔ایک نابینا اور ضعیف عالم سے خوف زدہ

ایک نابینا، ضعیف، بیمار اور امریکہ کی حکومت کی اجازت سے امریکہ میں رہائش پذیر مصری عالم شیخ عمر عبدالرحمن اور ان کے بھائیوں کو سزائے قید دیئے جانے پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ایک اسلام پسند مصری تنظیم نے دھمکی دی ہے کہ اگر شیخ عمر عبدالرحمن اور ان کے بھائیوں کو رہا نہ کیا گیا تو تمام دنیا میں 1991ء کے طرز پر امریکی مفادات پر وار کیا جائے گا۔

گزشتہ ہفتہ ایک نچلی عدالت نے شیخ عمر عبدالرحمن کو دیگر نو افراد کے ساتھ سزائیں سنائی تھیں، شیخ عمر عبدالرحمن کو عمر قید کی سزاء دی گئی ہے۔ان پر اقوام متحدہ کی عمارت، حکومت امریکہ کی ایک عمارت اور نیویارک کی دو سرنگوں میں دھماکے کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔حکومت امریکہ کی طرف سے اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ اگر شیخ عمر عبدالرحمن ایک خطرناک شخصیت تھے تو ان کو امریکہ میں داخلہ کی اجازت کیوں دی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو کیوں جاری رہنے دیا گیا۔ سیاسی مبصرین نے کہا ہے کہ امریکی عدالت کے فیصلے کی پشت پر اسلام دشمنی اور نسل پرستی کے جذبات نمایاں ہیں۔ یہ مبصرین یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ دنیا کی

واحد سپر طاقت ایک نابینا اور ضعیف مسلم عالم سے کیوں خوفزدہ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی نیوز ایجنسیوں نے شیخ عمر عبدالرحمن کے خلاف مقدمہ کے فیصلے کی خبریں دیتے ہوئے ان کے نابینا ہونے کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔'' (5رجنوری 1996ء)

اسلام پسند اور تحریکات اسلامی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دماغوں میں اسلام کو حکمراں بنانے، اسلام کو غالب کرنے اور اسلامی قوانین کو جاری و نافذ کرنے کی آرزوئیں اور نظریات پرورش پا رہے ہیں اور جو مخالف اسلام عقائد، خیالات اور افکار کا علمی اور عملی دونوں میدانوں میں مقابلہ کرنے کے لئے کوشاں ہیں اس صورت حال کو دیکھ کر اسلام مخالف حلقوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا ہے حالانکہ اسلام پسندوں کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کی وہی پوزیشن ہے جو نابینا شیخ عمر عبدالرحمن کے مقابلہ میں امریکہ کو حاصل ہے۔ جب دو متصادم قوتوں کے درمیان یہ نسبت ہو تو ظاہر ہے کہ کمزور فریق کا کتنا نقصان ہوگا اور اس پر کتنی مار پڑے گی اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا چنانچہ اس تصادم اور ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو نقصانات اٹھانے پڑ رہے ہیں ان کا حوالہ دیکر مسلمانوں میں سے ایک دانشور طبقہ اپنی اعلیٰ قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آرہا ہے اسلام پسندوں کو مطعون کر رہا ہے اور عقلی، اخلاقی اور دینی ہر پہلو سے ان کو غلط بتا رہا ہے اور اعلان کر رہا ہے اس کے لئے وہ اسلامی تاریخ کی نئی توجیہ، قرآنی اور دینی اصطلاحات کو ایک نیا معنی پہناتے ہوئے دینی اقدار اور مسلمات کا تیا پانچا کر دے رہے ہیں کہ اس کے بغیر وہ اسلام پسندی کی روک و روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں موجودہ حالات کے اس پس منظر میں اس قسم کے دانشوروں کی ہمت افزائی اگر وقت کی غالب تہذیب کے علمبرداروں کی طرف سے بھی کی جارہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اسلام پسندوں سے بہت سی علمی، عملی اخلاقی اور فنی کمزوریاں سرزد ہو رہی ہوں گی۔ جن پر نکیر کرنی چاہئے اور ان کی اصلاح کے لئے واجبی کوشش بھی ہونی چاہئے۔ مگر اس کے بجائے یہ مسلمان دانشور مستشرقین یورپ اور فسطائیت اور جارحانہ فرقہ پرستی کے نمائندوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فکر اسلامی کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ یہ فکر ہے۔ لیکن ان کی بات کو کم از کم اسلامی دنیا کوئی وزن نہیں دے سکتی تھی اس لئے انہوں نے کتاب وسنت پر مبنی سلف صالحین سے ورثہ میں ملے ہوئے جذبہ اور فکر ہی پر تیشہ چلانا شروع کر دیا۔ اور گزشتہ تقریباً چار سو سال کے علماء اور مصلحین کو بے خبر اور کتاب وسنت سے نابلد قرار دیا جانا ضروری ٹھہرا۔ ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اور ظلم وبربریت کا مظاہرہ کرنے والوں پر نگاہ غلط بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

اس سلسلہ کی ایک تحریر برادر محترم مولانا وحیدالدین خان صاحب کی ''فکر اسلامی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے اور بطور خاص مجھے بھی ایک صاحب نے عنایت کی اور پڑھنے کی خواہش کی۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے چند مباحث کا نوٹس لینا ضروری سمجھا گیا۔

دعوت حق کی مخالفت

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

علّامہ اِقبالؔ نے اس شعر میں ایک تاریخی حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ برادر محترم اس کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کو بے خبری اور زمانہ ناشناسی کا ایک نمونہ قرار دیتے ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کا ناقابل تلافی نقصان ہو رہا ہے اس تاریخی حقیقت کو رد کرنے کیلئے مولانا مودودیؒ کی ایک عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے برادر محترم لکھتے ہیں:

''سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نزدیک اسلام ایک مکمل سیاسی انقلاب کی تحریک ہے اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پرجوش طور پر لکھتے ہیں:

''آج دنیا آپ کے موذن کو اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لئے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں اور نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کو اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا۔ کسی قانون کو میں نہیں مانتا۔ کسی عدالت کے حدود و اختیارات مجھ تک نہیں پہنچتے۔ کسی کا حکم میرے لئے حکم نہیں ہے۔ کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سواء میں سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خود کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکا یک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہوگئے ہیں اور ہر طرف آپ کیلئے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔'' (اِسلامی سیاست، دہلی، ۱۹۸۶ء، صفحہ: ۷۵۔۷۶)

''سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ پرجوش الفاظ اس لئے لکھے کہ انہوں نے دیکھا کہ آج ہماری مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی ہے تو کوئی اس کی وجہ سے ہم سے لڑنے نہیں آتا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ

میں توحید کی آواز بلند کی تو ہر طرف سے متشددانہ مخالفت شروع ہوگئی۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۱۷۷)

''یہ الفاظ دور جدید سے بے خبری کا ثبوت ہیں۔ مصنف اگر زمانہ حاضر سے گہری واقفیت رکھتے تو وہ جانتے کہ اس فرق کا سبب زمانی عامل (Age Factor) ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تعذیب (Religious Persecution) کا زمانہ تھا، موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ مذکورہ فرق لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے سیاسی مفہوم کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ زمانی فرق کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود سید ابوالاعلیٰ مودودی جو یقینی طور پر اس ''انقلابی مفہوم'' کے حامل تھے، انہوں نے اور ان کی جماعت نے غیر منقسم ہندوستان میں دس سال تک اپنے انقلابی مفہوم کے مطابق ''اذان'' دی۔ مگر یہاں کی حکومت نے کبھی اس بناء پر ان کی پکڑ دھکڑ نہ کی۔ اور نہ ان کے سروں پر اس وجہ سے آرے چلائے گئے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اگر اس زمانی فرق کو جانتے تو اس کو وہ اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم امکان سمجھتے۔ مگر اس فرق کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے وہ اس کو استعمال نہ کر سکے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۲۰۲)

یہاں ضمنی طور پر ہم دو باتوں کی وضاحت کرنی ضروری سمجھتے ہیں اول یہ کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اسلام کو محض مکمل سیاسی انقلاب کی ہی تحریک نہیں سمجھتے بلکہ ہر اعتبار سے اسلام کو مکمل سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر شعبۂ زندگی میں خواہ معاشی ہو یا معاشرتی اخلاقی ہو کہ سیاسی اسلام انقلاب کا داعی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ برادر محترم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا مودودی پھانسی کی سزاء کا فیصلہ سن کر مسکرا چکے ہیں اور جہاں تک ہندوستان کی بات ہے ہم کہہ سکتے ہیں جماعت اسلامی کے مرکزی قائدین میں سے شاید ہی کوئی ہو جس نے جیل کی روٹی نہ کھائی ہو۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس بات کا اعتراف برادر محترم نے خود بھی کیا ہے لیکن یہاں بھول گئے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

''اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت حق کے تمام جدید امکانات تباہ ہو کر رہ گئے۔ مدعو انتہائی غیر واقعی طور پر داعی کا حریف بن گیا دونوں کے درمیان داعیانہ تعلق ایک خود پیدا کردہ حریفانہ تعلق میں تبدیل ہو گیا۔''

(فکر اسلامی، صفحہ:۱۱)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسوں کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ دعوت حق کو سیاست اور حکومت کے دائرہ میں قدم نہیں رکھنا چاہئے۔ لیکن آج کچھ لوگوں نے دعوت کی ایسی سیاسی اور انقلابی تعبیر کی کہ حکمراں طبقہ دعوت کا

مدمقابل اور مخالف بن گیا۔

دعوت کی پوری تاریخ میں ایک عام آدمی دیکھتا ہے کہ نمرود، فرعون اور سرداران قریش جیسے سر برآوردہ لوگوں نے ہمیشہ دعوت کی مخالفت کی ہے چونکہ تاریخی طور پر اس کا انکار ممکن نہیں تھا اس لئے اس خلش کو دور کرنے اور سامنے کے آدمی کو خاموش کرنے کے لئے یہ توجیہ پیش کر دی گئی کہ اب زمانہ بدل گیا اور اس دور کے نئے داعیانِ اسلام اس تبدیلی کو سمجھ نہیں سکے۔ تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ جب کہ سرکاری مذہب کے سواء کسی دوسرے مذہب کے لئے آزادی نہیں تھی اس کے برخلاف موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے اس بات کو نہ سمجھنے کی بناء پر یہ سمجھ لیا گیا کہ دعوت کے صحیح ہونے کی علامت حکمراں طبقہ کی مخالفت ہے۔

یہاں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ کہ برادر محترم سیاسی تعبیر کو غلط کہنے کی صرف ایک دلیل دے رہے ہیں وہ ہے حکمراں طبقہ کا مدمقابل اور مخالف بن جانا جس کی بناء پر دعوت کے بہت سارے امکانات ختم ہو گئے اور نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کا جانی و مالی بھاری نقصان ہو رہا ہے اس پس منظر میں یہاں تین سوال اٹھتے ہیں۔

(۱) کیا واقعی زمانہ میں وہ تبدیلی ہوئی ہے جس کی نشاندہی کی گئی ہے؟

(۲) کیا واقعی دعوتِ اسلامی کی مخالفت ہمیشہ کی گئی ہے اگر کی گئی ہے تو کیوں؟

(۳) دعوت اسلامی کے بنیادی اجزاء کیا ہیں؟

اب ہم ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں کوئی دور تھا جب کہ سارے کام پتھر سے لئے جاتے تھے جس کو پتھر کا دور کہا جاتا ہے اس کے بعد لوہے کا دور آیا اور انسان اپنی بیشتر ضروریات پوری کرنے کے لئے لوہا استعمال کرنے لگا اسی طرح موجودہ دور اپنی خصوصیات کی بناء پر سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانہ کی ساری تبدیلیوں کے باوجود انسان انسان ہی رہا۔ اس کی فطرت اور نفسیات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور نہ آسکتی ہے۔ انسان ہی کیا قدرت نے اول دن جس شئ کو جس خاصیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے وہ خاصیت اس کے ساتھ قیامت تک لگی رہے گی اس طرح انسان پہلے دن جیسا تھا آخری دن بھی ویسا ہی رہے گا۔ اس کی فطرت میں تبدیلی ہونے والی نہیں ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ حالات بدلے ہیں مختلف میدانوں میں ان گنت ترقیاں اور تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور انسان نے ہر میدان میں فنی اور انتظامی لحاظ سے اپنے معاملات زندگی کو منظم کیا ہے یہ چیز سماجیات، اقتصادیات اور سیاسیات سبھی شعبوں میں دیکھی جا سکتی ہے ہر چیز کو ایک فن اور سبجیکٹ بنا کر محنت کی جا رہی ہے

ایسی حالت میں ہر شعبۂ زندگی میں ردوبدل ہوگا اور ترقی بھی ہوگی مثلاً آجر اور مستجیر کے درمیان تعلق کیا ہو ان دونوں کے حقوق کیا ہیں۔ان کو الگ الگ کن باتوں کا پابند ہونا چاہئے؟

یہ سوالات اور مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں۔لیکن پہلے کے مقابلے میں آج ان کو زیادہ منظم کیا گیا ہے اسی طرح حکمراں اور رعایا کے باہمی ربط وتعلق اور حقوق کو دفعہ واری انداز میں منظم اور مرتب کیا گیا ہے خاندان کا دائرہ کیا ہے سماجی حد کیا ہے سیاست کا عمل دخل کہاں تک رہے اسی پس منظر میں مذہب اور سیاست کو دوخانوں میں بانٹ کر دونوں کی سرحدیں متعین کردی گئی ہیں یہ ایک طرح کا بندوبست اپنایا گیا ہے تاکہ ٹکراؤ سے بچا جائے۔مگر اس کے باوجود مذہب اور سیاست کا تصادم ہوتا رہتا ہے بلکہ ہوتا رہا ہے اس کی وجہ یہ بتانا کہ پہلے زمانہ میں حکمراں کا مذہب قبول کرنا ہر شخص کے لئے ضروری تھا۔اس لئے ٹکراؤ ہو رہا تھا خلاف واقعہ اور فضول سی توجیہ ہے۔حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نوسو برس تبلیغ کرتے رہے اور مخالفتوں کا سامنا کرتے رہے یعنی اتنی طویل مدت تک حکمراں طبقہ کا دین آپ نے قبول نہیں کیا۔مصر میں بنی اسرائیل خواہ کتنے ہی بے عمل اور بگڑے ہوئے تھے لیکن کہیں سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے فرعون کا دین قبول کرلیا ہو۔جیسے تیسے بہرصورت وہ مسلمان کی حیثیت میں اپنی الگ شناخت رکھتے تھے۔اگر وہ ویسے ہی پڑے رہتے اور موسیٰ علیہ السلام ان کو وعظ سناتے رہتے تو کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں دعوت حق لے کر پہنچے اور کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو بنی اسرائیل پر ظلم وستم بند کرو۔فرعون نے یہ نہیں کہا کہ تم اپنے گھر میں میرے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے جا کر کہا کہ تم حاکم نہیں ہو۔تم بندے ہو۔سرکشی چھوڑو۔بندگی اختیار کرو۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ ہے پہلے نمرود نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ تم دوسرے مذہب کو کیوں مانتے ہو؟ میرے مذہب کو قبول کرو۔چھیڑا تو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر، بے زور، کمزور اور عاجز پتھر کی مورتیوں کو کیسے پوجتے ہو! اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو۔اسی طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ ہے سرداران قریش نے آکر نہیں کہا کہ ہمارے تین سو ساٹھ بتوں کو کیوں نہیں پوجتے۔وہاں تو بڑی آزادی تھی۔ہر قبیلہ کا ایک الگ بت تھا۔بڑی سیکولر فضاء تھی۔

کشمکش اس وقت شروع ہوئی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی لوگوں کو بلا کر صاف صاف بتادیا کہ تم جس راہ پر چل رہے ہو وہ ہلاکت کی طرف جارہی ہے کوہ صفا پر چڑھ کر عام آواز لگائی، اللہ وحدہٗ لاشریک کی

عبادت اور اپنی اطاعت کی دعوت دی۔ گویا اعتراض یہ نہیں تھا کہ ایک شخص ہمارے عقیدہ کے سواء دوسرا عقیدہ کیوں رکھتا ہے بلکہ اعتراض کی بات یہ تھی کہ یہ شخص ہمارے عقیدہ کو غلط بتاتا ہے اور اپنے عقیدہ کو نہ صرف یہ کہ صحیح قرار دیتا ہے بلکہ اس کی تبلیغ اس انداز میں کرتا ہے کہ لوگ اپنے سابقہ عقیدہ کو چھوڑ کر اس کے پیروکار بن جائیں۔ یہ وہ بات تھی جس نے تہلکہ مچا دیا۔ مولانا حالیؔ نے اسی کو کہا ہے۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

پھر دیکھئے اللہ کے نبی ﷺ نے کسی موقع پر اس ضمن میں کمپرومائز کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ فریق مخالف کی طرف سے بار بار کوشش کی گئی کہ تھوڑی کمی بیشی کر کے کشمکش کو ختم کیا جائے لیکن اللہ کے رسول ﷺ اپنے موقف سے ذرہ برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس رخ سے تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا پہلے اور اب کو اس طرح تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے کہ اب مذہبی آزادی کا دور ہے اور پہلے مذہبی جبر کا دور تھا۔ یہ تاریخ کا نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب بے لاگ لپیٹ اور غیر لچکدار انبیائی طریق دعوت اپنایا جائے گا تو کشمکش اور محاذ آرائی سے مفر نہیں ہوگا۔

اس دور میں ترقی یہ ہوئی ہے کہ مذہب اور سیاست کی قدیم لڑائی کو ختم کرنے کے لئے اہل سیاست نے صلح کی ایک راہ نکالی ہے اہل مذہب کی طرف سے نہیں بلکہ اہل سیاست کی جانب سے کمپرومائز کی کوشش کی گئی ہے اور چونکہ اہل سیاست کے پاس سارے وسائل و ذرائع ہیں اس لئے انہوں نے اپنے مؤثر ترین ذرائع ابلاغ اور اپنی اعلیٰ تکنیک سے کام لیتے ہوئے ایسی فضاء پیدا کر دی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ہی چاہئے کہ مذہب سیاست میں دخل نہ دے۔ بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سیاسی میدان میں آج جو سب سے بڑی گالی دی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ فلاں شخص مذہب اور سیاست کو خلط ملط کر رہا ہے اور دوسری طرف مذہبی لوگ حالات کے دباؤ کے تحت گوشہ نشینی کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئے مذہب اور سیاست کے درمیان صلح کے جس فارمولہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کا نام ہے سیکولرزم۔ اہل سیاست کی یہاں بھی یہ ایک عیاری اور فریب کاری دیکھی جاسکتی ہے کہ وہ عام طور پر سیکولرزم کے ایک رخ کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں کہ سیکولرزم کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ کسی مذہب کی طرفداری حکومت نہیں کرے گی۔ اس نظام حکومت میں تمام مذاہب کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ سیکولرزم کے دوسرے رخ کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ وہ یہ کہ کسی مذہب کو سیاسی اور اجتماعی امور میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ مذہب کا دائرہ پرائیویٹ زندگی سے آگے

نہیں ہے۔ سیکولرزم کا یہ دوسرا رخ بھی کوئی نظری نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ جن کے مذہب میں اجتماعی زندگی کے امور و معاملات سے متعلق ہدایات اور تعلیمات نہیں ہیں ان کا اس فریب میں مبتلا ہونا قرین قیاس ہے لیکن جن کا مذہب نجی زندگی، خاندان، معاشرہ، سوسائٹی اور امور مملکت و سیاست سے یکساں طور پر بحث کرتا ہے اور جن کا دعوی ہے کہ ان کا مذہب ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہے اور اس کے کسی بھی جزء کو چھوڑ نا بھاری جرم ہوتا ہے۔ ان کا سیکولرزم کے فریب میں مبتلا ہونا کیا معنی رکھتا ہے وہ لوگ آخر کس طرح مذہب کی اجتماعی زندگی سے متعلق تعلیمات کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ چنانچہ یہ ایک صاف بات ہے کہ ایک غیر مسلم نے ابھی حال میں لکھا ہے کہ جو لوگ اپنے مذہب کے متعلق ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے منہ سے سیکولرزم کی بات نا قابل فہم ہے۔

غرض یہ کہ مذہبی جبر اور مذہبی آزادی کے دو زمانوں میں حالات زمانہ کو تقسیم کرنا بالکل ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی سر ہے اور نہ پیر۔ کبھی پہلے سراسر جبر کا دور تھا اور نہ اب سراسر مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔

پہلے بھی حکمراں طبقہ اپنے مصالح کے تحت جبر یا آزادی کی پالیسی اختیار کرتے تھے اور آج بھی سیکولر حکومتیں خالص اپنی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر جبر پر مبنی یا آزادی پر مبنی پالیسیاں بناتی ہیں اور رویہ اختیار کرتی ہیں۔ آج ایک حد تو وہ ہے کہ جس میں مذہب کا نام لینا ثابت ہوجائے تو بحیثیت ممبر پارلیمنٹ و ممبر اسمبلی کامیاب آدمی ناکام قرار دے دیا جائے گا۔ جرم قتل کی سزاء بھگتنے والا آدمی جیل میں بیٹھ کر پارلیمنٹ کی سیٹ جیت سکتا ہے لیکن ایک مذہبی آدمی اپنی مذہبی حیثیت میں نہ پارلیمنٹ کی ممبری کا امیدوار بن سکتا ہے نہ سیاسی فیلڈ میں کام کرسکتا ہے اور اگر وہ کرتا ہے تو نا اہل قرار دیا جائے گا۔ دوسری حد وہ ہے جہاں آزادی دی گئی ہے وہ آزادی بھی بسا اوقات سلب کر لی جاتی ہے مثلاً کئی مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ مساجد میں جمعہ کی نماز نہیں ہوسکی۔ اور جس نے مسجد میں پہنچنے کی کوشش کی وہ پکڑا گیا اس لئے کہ انتظامی لحاظ سے جو قانون لاگو کیا گیا ہوتا ہے وہ ان خاص حالات میں اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص گھر سے باہر قدم نکالے۔

ا۔ ہندوستان کے بڑے علاقہ میں گائے کی قربانی نہیں کی جاسکتی۔ کیوں؟

اس لئے کہ اکثریتی طبقہ کو یہ چیز ناپسند ہے۔ سیکولر نظام نے مذہبی آزادی دی ہے تو آخر اس کی حفاظت کیوں نہیں کی جاتی۔ بابری مسجد میں سینکڑوں برس سے نماز پڑھی جارہی تھی جب انتظامی مصلحتوں کا تقاضا ہوا نمازیوں کے لئے مسجد بند کردی گئی اور پچاس سال کے عرصہ میں بھی سیکولر عدالت کوئی فیصلہ نہ کرسکی۔ نقصِ امن کے اندیشہ

کے تحت نمازی کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا لیکن دوسری طرف دن کی روشنی میں مسجد کو منہدم کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی جگہ مندر تعمیر کیا جاتا ہے اور جب وہ اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں تو پورے اعزاز کے ساتھ بحفاظت انہیں ان کے گھروں تک پہنچایا جاتا ہے یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ حکمراں طبقہ کی مصلحتوں کا یہی تقاضا تھا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

۲۔ کیا واقعی دعوتِ اسلامی کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے اگر ایسا ہے تو کیوں؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا سب سے معتبر ماخذ قرآن کریم ہے قرآن میں کل چھبیس[۲۶] انبیاء کرام کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے کہ فلاں نبی کے حسن سیرت، حسن کردار اور حسن سلوک کی بناء پر قوم نے ان کی واہ واہ کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا یا فلاں نبی نے اعلیٰ درجہ کی حکمت، موعظۂ حسنہ اور مجادلۂ احسن کے ساتھ دعوت پیش کی کہ پوری قوم گرویدہ ہوکر حلقہ بگوش ایمان ہوگئی اس کے برخلاف قرآن جو منظر پیش کرتا ہے اس کے لئے مندرجہ ذیل آیات اور ان کے سیاق وسباق پر نظر ڈالئے۔

قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ. (آل عمران:۱۸۳)

ترجمہ: ان سے کہو تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لاتے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا ذکر تم کرتے ہو پھر تم نے ان رسولوں کو کیوں قتل کیا۔ اگر تم سچے ہو۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ. (آل عمران:۱۸۴)

ترجمہ: اب اے نبی! اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ. (الانعام:۱۰)

ترجمہ: اے نبی! تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، تو ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہوکر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَ الْجِنِّ یُوْحِیْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَ مَا یَفْتَرُوْنَ. (الانعام:۱۱۲)

ترجمہ: اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاء کرتے رہے ہیں اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّ عَادٌ وَّ فِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ○ وَ ثَمُوْدُ وَ قَوْمُ لُوْطٍ وَّ اَصْحٰبُ الْئَیْكَةِ اُولٰٓىِٕكَ الْاَحْزَابُ ○ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ. (ص:۱۲-۱۴)

ترجمہ: ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور میخوں والا فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والے جھٹلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔

وَ كَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَ رُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِیْدًا وَّ عَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا. (الطلاق:۸)

ترجمہ: کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔

وَ لَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰۤى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَ لَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِیْنَ (الانعام:۳۴)

ترجمہ: تم سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّ یَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (ال عمران:۲۱)

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپہ ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لئے اٹھیں ان کو دردناک سزاء کی خوشخبری سنادو۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ. (المائدہ:۷۰)

ترجمہ: ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لیکر آیا تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

قرآن کی ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ داعیان حق کو ہمیشہ کشمکش اور آزمائش سے گزرنا پڑا ہے ان کے ساتھ استہزا بھی کیا گیا مار پیٹ کی اذیت بھی دی گئی، گھر بار سے نکالا بھی گیا، قتل بھی کیا گیا، آرے سے جسم کو چیرا گیا اور سولی پر چڑھانے کی کوشش بھی کی گئی۔ غرض کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے جو ان پر نہ ڈھائی گئی ہو اور یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں اگر یہ کہا جائے کہ آزمائش وابتلا بھی ایک نمایاں علامت ہے کسی دعوت کے دعوت حق ہونے کی تو اس کی تردید کیونکر کی جاسکتی ہے۔

اس حقیقت کو مزید ایک دوسرے رخ سے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر بھی غور کیا جانا مفید ہوگا آلام ومصائب میں مبتلا کیا جانا اس لئے ضروری بتایا گیا ہے کہ اس کے بغیر سچے اور جھوٹے، کھرے اور کھوٹے کی تمیز نہیں ہوسکتی۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ

(سورۂ محمد:۳۱)

ترجمہ: اور ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (ال عمران:۱۸۶)

ترجمہ: مسلمانو! تمہیں مال وجان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اگر ان سب حالات میں تم صبر وخدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ. (البقرۃ:۲۱۴)

ترجمہ: پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتی کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخاطبین کے درمیان کشمکش کا یہ تسلسل ظاہر ہے کہ بلا وجہ نہیں ہوسکتا ضرور بالضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ ہوگی۔ وہ وجہ کیا ہے؟ ہمارا خیال ہے تھوڑے سے غور و تامل سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہاں موٹی موٹی تین وجوہ کو ہم بیان کرتے ہیں۔

پہلی وجہ:

انبیاء علیہم السلام کی دعوت مختصر لفظوں میں یوں ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنَ. (الشعراء:۱۴۴)

ترجمہ: اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

یہ الفاظ قرآن میں نو دس بار آئے ہیں۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (الاعراف:۵۹)

ترجمہ: یعنی اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تقویٰ، احسان اور نیکی و بھلائی کی بات کی جائے تو کوئی ایسا نہیں ہوگا جو ناک بھوں چڑھائے سب کو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں بلکہ ہر سننے والا سر دھنتا اور واہ واہ کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلاں فلاں کام نہ کرو اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو تو بات میں تلخی پیدا ہوجاتی ہے یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انبیاء علیہم السلام اور دوسرے عام نیکی اور بھلائی کا پرچار کرنے والوں کے درمیان فرق ہوجاتا ہے انبیاء علیہم السلام جہاں یہ کہتے ہیں کہ نیکی کرو۔ وہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ ان برائیوں سے بچو۔اسی طرح جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو۔ وہیں یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور جتنے بھی خدائی کے دعویدار ہیں ان سب کو ٹھکرادو۔یہیں سے وہ کشمکش اور تصادم شروع ہوتا ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں قرآنی آیات کی روشنی میں کیا گیا ہے چنانچہ شعیب علیہم السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہم السلام سے کہا:

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ. (ھود:۹۱)

ترجمہ: انہوں نے جواب دیا اے شعیب! تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے۔ تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔

دیکھئے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کیا کہتی ہے:

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ. (ھود:۶۲)

ترجمہ: انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔

اللہ کی عبادت اور اللہ سے تقوی کی تلقین اور دعوت مثبت بات تھی جس سے کسی کو انکار نہیں ہوتا اور نہ کسی کو نا گواری گزرتی لیکن جب یہ کہا گیا کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اللہ کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ رکھو اور فلاں فلاں کام نہ کرو تو تلخی کا پیدا ہونا یقینی ہو گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے بندگی رب کی دعوت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی بندگی اور عبادت کے انکار کی بات کہی اور منکرات سے اجتناب کی نصیحت کی تو قوم کے لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے اور وہ جس انتہاء کو پہنچے اس کا تذکرہ ابھی اوپر کیا گیا۔ ایسے ہی ہر نبی نے مثبت اور منفی دعوت کے ساتھ ساتھ اپنے زمانہ کے نمایاں فحشاء اور منکرات کے خلاف مؤثر آواز بھی اٹھائی ہے ظاہر ہے کہ زمانہ اس کو کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا تھا!

دوسری وجہ:

مثبت اور منفی، جامع اور مانع دعوت بھی گوارا ہو سکتی تھی لیکن اگر تھوڑی رواداری اور نرمی سے کام لیا جاتا اور ذرا لچک دار پالیسی اپنائی جاتی۔ مصلحت اور ہوشیاری کو پیش نظر رکھا جاتا اور خطرات کو خود دعوت دینے کی ابتداء اپنے ہاتھوں نہ کی جاتی۔ چنانچہ اس پہلو سے انبیاء علیہم السلام کا کیا موقف ہے؟ اسے مندرجہ ذیل آیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ. (القلم:۹-۸)

ترجمہ: لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ، یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ○ (بنی اسرائیل: ۷۴-۷۳)

ترجمہ: اے نبی! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنہ میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے۔ تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. (ھود: ۱۱۳-۱۱۲)

ترجمہ: پس اے نبی اور تمہارے وہ ساتھی جو پلٹ آتے ہیں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

معلوم ہوا کہ دعوت کے باب میں مداہنت، مصلحت پرستی، ظالموں کی رو رعایت اور ان کی طرف جھکاؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی داعی اس نکتہ کو مدنظر نہیں رکھتا تو کارِ دعوت اس کے لئے باعث اجر و ثواب ہونے کے بجائے سخت گرفت کا سبب ہوگا۔ حکمت دعوت کے نام پر جس مصلحت پرستی اور مداہنت کا آج عموماً مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اللہ کے روبرو حساب کے تصور کے ساتھ اپنی فکر اور اپنے عمل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ ہمیں اس فتنہ سے محفوظ رکھے۔ آمین!

تیسری وجہ:

ایک اور رخ سے دیکھئے کہ دعوتِ اسلامی کا اللہ کی عبادت، تقویٰ، توکل، انابت اور برائیوں کے ترک کے

علاوہ ایک اہم جز یہ ہے کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں اطیعونی (کہ میری اطاعت کرو) چنانچہ قرآن نے یہ صراحت بھی کردی ہے کہ......

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (النساء:٦٤)

ترجمہ: یعنی جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں اس لئے بھیجے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔

دعوت کا یہ جز انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس سے زمین پر قیادت، حکمرانی اور پیشوائی کا دعوی کرنے والوں کی کرسی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور قائد کو پیرو اور متبوع کو تابع بن جانے کا الٹی میٹم دیدیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی سلطان کائنات کا نمائندہ ہوتا ہے اس لئے بجا طور پر بلا کسی قید و شرط کے وہ اپنی اطاعت کا مطالبہ کرے گا اور خود کسی کی تابعداری ماتحتی اور محکومیت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا ہر نمرود، فرعون، ابوجہل و ابولہب۔ حضرات انبیاء کرام خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درپۓ آزار ہوگئے اور اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے جب تک اللہ کے نبی کو ملک بدر نہیں کردیا بلکہ ملک بدر کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیا کہ مبادا کہیں طاقت میں آکر ہمارے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو فرعونی حکومت کے بڑے لوگوں نے عوام سے کہا کہ یہ شخص تم کو تمہارے ملک سے بے دخل کردینا چاہتا ہے سوال یہ ہے کہ فرعونی حکومت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے کو اتنی اہمیت کیوں دی؟ جب کہ ان کے ساتھ اس وقت ان کے بھائی کے علاوہ کوئی دوسرا ان کا معاون و مددگار نہ تھا۔

اگر ایک غلام قوم کا بے سروسامان آدمی یکا یک اُٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیاء تک اور بحر روم کے ساحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا۔ تو محض اس کے اس فعل سے کہ اس نے ایک لاٹھی کو اژدہا بنادیا اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہوجاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقے سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کردے گا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعوی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پورے

نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں، جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمّن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کھلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لئے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لئے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے رسالت کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کے سامنے سیاسی ومعاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کو صادق وامین کہا جاتا تھا اور مکارم اخلاق کا اعلیٰ نمونہ لوگ سمجھتے تھے لیکن جب آپ نے کھل کر اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو مکہ کے ماحول میں جیسے ایک زلزلہ آ گیا اور قریش اٹھ پڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غیر اللہ کی الوہیت کے انکار اور رسالت وآخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی بے چوں وچرا اطاعت کی جائے، یعنی اس طرح کہ دوسرے تو درکنار خود اپنی جان اور مال تک کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے اور اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ والوں کو دینی رنگ میں اہل عرب پر جو بڑائی اور برتری حاصل تھی اس کا صفایا ہو جائے گا اور اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مقابلہ میں انہیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہے گا یعنی نچلے طبقے پر انہوں نے جو مظالم روا رکھے تھے اور صبح وشام جن برائیوں میں لت پت رہتے تھے ان سے دست کش ہوتے ہی بنے گی۔ قریش اس مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اس لئے ان کی طبیعت اس ''رسواء کن'' پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کا مطلب تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں پورے طور پر آ جانا۔ اپنی خود رائی اور اپنے اقتدار سے دستبردار ہو کر مکمل طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابع داری کو اختیار کر لینا۔ جس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔

مسلمان کا قائدانہ مقام

برادرِ محترم کہتے ہیں:

''عصر حاضر میں اسلامی فکر کی تشکیل نو کا کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی زیادہ وہ مشکل بھی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں ایک طرف اگر عصر حاضر کا گہرا مطالعہ ضروری ہے تو اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ آدمی کو اسلام کی تعلیمات اور اس کی روح سے کامل درجہ کی واقفیت حاصل ہو۔ اس دوطرفہ شرط میں ادنی کمی بھی بھیانک غلطی تک پہنچانے کا سبب بن سکتی ہے۔

اس کی ایک مثال ''امامت اقوام'' کا وہ جدید نظریہ ہے جس کو کچھ مسلم مفکرین نے اسلام کی انقلابی تعبیر کے طور پر پیش کیا ہے اس نظریہ کے مطابق مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں۔ مسلمانوں کو خدا کی طرف سے یہ منصب عطا کیا گیا ہے کہ وہ ''انسانی حاکموں'' کو بزور تمام دنیا میں اقتدار سے ہٹائیں اور انسانوں کے اوپر خدا کی حکومت (عملی طور پر خود اپنی حکومت) قائم کردیں۔

اس نام نہاد انقلابی نظریہ کے لئے قرآن یا حدیث رسولؐ میں کوئی دلیل نہیں۔ اس کی دلیل عہد صحابہ کے ایک واقعہ سے نکالی گئی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب ایرانی حکومت سے مسلمانوں کا ٹکراؤ ہوا۔ تو اس دوران مسلم لشکر کے سردار سعد بن ابی وقاصؓ نے گفت وشنید کے لئے کچھ وفد ایرانی حکمرانوں کے یہاں بھیجے۔ ان میں سے ایک ربعی بن عامرؓ تھے۔ ربعی بن عامرؓ جب ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں پہنچے تو رستم سے ان کی لمبی گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

قال رستم ما جاء بکم قال اللّٰہ ابتعثنا واللّٰہ جاء بنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللّٰہ۔ (تاریخ طبری)

ترجمہ: رستم نے پوچھا کہ تم کس لئے ہمارے ملک میں آئے ہو انہوں نے کہا کہ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے، اور ہم کو اللہ لے آیا ہے تاکہ وہ جس کو چاہے اس کو ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔

صحابی کی اس تقریر سے مذکورہ سیاسی نظریہ نکالنا بلاشبہ ایک نامحمود جسارت ہے حتی کہ وہ اسلام کی تصویر کو بگاڑنے کے ہم معنی ہے۔ صحابی کے مذکورہ قول میں اسلام کی توسیعی انسانیت (Extended Humanity) کو بتایا گیا ہے۔ مگر عدم واقفیت کی بناء پر غلط تعبیر کر کے اس کو اسلام کی توسیعی سیاست (Extended Politics) کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یہ یقینی طور پر صحابی کے ایک قول کی نہایت غلط توجیہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت ایرانی حاکموں اور اہل اسلام کے درمیان جنگ پیش آئی۔ لیکن جنگ کی حیثیت پورے معاملہ میں محض اضافی یا اتفاقی تھی۔ وہ اس کا اصل مطلوب نہ تھی۔'' (صفحہ ۱۱-۱۲)

اوپر نقل کردہ اقتباس میں جو بات بڑے اونچے مقام سے برادر محترم نے فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ جاننے کے لئے دو سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

① یہ نظریہ کہ مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں کیا دینی اعتبار سے صحیح ہے؟

② کیا اس نظریہ کا ماخذ عہد صحابہؓ کا محض ایک واقعہ ہے؟

اس موقع پر قرآن وسنت اور دینی دلائل سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر کے سوچئے دنیا کی ہر قوم اور ہر گروہ کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات جان تک کی بازی لگا دیتا ہے یا کم از کم آرزو اور تمنا رکھتا ہے کہ وہ اقوام عالم کا

قائد اور حاکم بنے اس کے لئے اپنی نئی نسل کے اندر ذہنی بیداری، ہمت اور حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے ان کے اندر یہ شعور جگانے کے لئے ہر قسم کا جتن کرتا ہے کہ وہ اٹھے اور کم از کم اپنے ہمسایہ قوموں میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کرے۔ ہمارے ملک میں کوئی کمیونٹی ایسی نہیں ہے جس کے اندر اس طرح کی کوشش نہ ہو رہی ہو سکھ قوم کی کیفیات کا مطالعہ کیجئے۔ ہزاروں برس سے دبائے ہوئے مظلوم طبقوں کو دیکھئے ان کے اندر کس قدر یہ جذبہ موجزن ہے۔ علاوہ ازیں ہندو قوم کا مجموعہ قائد اور حاکم بننے کیلئے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے اس تناظر میں اپنی پست ہمتی، مرعوبیت اور ذہنی وفکری زوال کو دیکھئے کہ غلبہ اور عزت حاصل کرنے اور دنیا کی قیادت ورہنمائی کرنے کی سوچ بھی ذہن ودماغ سے نکال دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ باور کرایا جارہا ہے کہ یہ سوچ نہ صرف یہ کہ تمہیں دنیا میں تباہ وبرباد کردے گی بلکہ آخرت میں بھی اس غیر مطلوب اور ناجائز تصور اور عمل کو لے کر جاؤ گے تو نجات وفلاح سے محروم ہو جاؤ گے تمہارے لئے امن وعافیت کی بس یہ راہ ہے کہ وقت کی غالب قوموں کے سامنے سر جھکائے ہوئے زندہ رہو تم کمزور ہو اقلیت میں ہو تمہارا کام ہر جبر وظلم کو صبر وشکر کے ساتھ جھیلتے رہنا ہے۔

بتایئے یہ طرزِ فکر کیا کسی قوم اور گروہ کو اپنے مقام پر باقی رکھ سکتا ہے چہ جائے کہ عزت اور وقار سے ہمکنار کرے؟ خصوصاً جبکہ یہ ماحول خارج سے بھی پیدا کیا جارہا ہے اور اندر سے بھی سیاسی دلائل دیئے جارہے ہوں اور دینی مقام پر بیٹھ کر دینی زبان اور دینی اصطلاحات میں بھی مسلمانوں کو مغلوبیت، محکومیت کی حالت میں مطمئن کرنے کی کوشش ہو رہی ہو۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے زوال کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس بے عقلی اور مردہ دلی کو تعمیری اور حقیقت پسندانہ طرز فکر، بڑے طمطراق کے ساتھ بلکہ بڑی بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کے بعد دین کے اصل سرچشموں یعنی کتاب وسنت میں تلاش کیجئے کہ کہیں امت مسلمہ کو محکوم ومغلوب بن کر جینے کی کوئی تلقین کی گئی ہے؟ چاہے آپ کتنے ہی دانشورانہ انداز میں اس سوال کا جواب ڈھونڈیں آپ کو ناکامی کے سواء کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف آپ پائیں گے کہ جولوگ کفر سے نہ لڑ سکتے ہوں اور زیر کفر زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش نہ کرتے ہوں ان کو سخت وعید سنائی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء:۹۷)

ترجمہ: جولوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم

کس حال میں مبتلا تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔

بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں پڑے ہوئے تھے اس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور فرمایا:

فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (طٰہٰ:۴۷)

ترجمہ: جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں۔ اور سلامتی ہے اس کیلئے جو راہ راست کی پیروی کرے۔

قرآن میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بکثرت بیان ہوئی ہے اس پوری سرگزشت میں کہیں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے کچھ حقوق اور مراعات مانگ کر مصر میں محکوم قوم کی حیثیت سے زندہ اور باقی رہنے کی خواہش کرتے ہوئے نظر نہیں آتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی کی دعوت اور دوسرا مقصد بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکالنا تھا، پھر قرآن میں امت مسلمہ کے بارے میں فرمایا گیا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (ال عمران:۱۱۰)

ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ خیر امت کا منصب اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ کام کوئی مقہور و مغلوب اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والا گروہ کرسکتا ہے؟ کیا یہ لقب مسلمانوں کو قائدانہ اور حاکمانہ مقام پر نہیں کھڑا کرتا؟ اسی طرح شہادت حق کی ذمہ داری دے کر شہداء علی الناس کے منصب پر فائز کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا شہادت اور قیادت قریب المعنی الفاظ نہیں ہیں؟ اور کیا یہ کام کوئی مرعوب اور مغلوب گروہ کرسکتا ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ

قَوۡمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ. (المائدہ:۸)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

عدل وقسط قائم کرنے کی ذمہ داری کیا یہ تقاضہ نہیں کرتی کہ پہلے ظالم اور جابر لوگوں کے پنجۂ استبداد سے خود یہ گروہ آزاد ہو۔ جو ظالموں اور مفسدین کے زیر اثر اور تابع ہوگا وہ دنیا میں اپنے سے ظلم اور زیادتی کو دور نہیں کرسکتا وہ دوسرے مظلوموں کی کیا دادرسی کرے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ احساس وشعور دلایا گیا ہے کہ تم اقوام عالم میں اونچا مقام رکھتے ہو، اپنے کو کمتر نہ سمجھو۔

فَلَا تَھِنُوۡا وَتَدۡعُوۡۤا اِلَی السَّلۡمِ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمۡ وَلَنۡ یَّتِرَکُمۡ اَعۡمَالَکُمۡ. (سورۂ محمد:۳۵)

ترجمہ: پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو احساس کمتری سے بچایا ہے اس لئے کہ جس گروہ میں یہ مرض پیدا ہوجائے گا وہ کسی میدان میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی بات تو دور کی ہے وہ غیروں کی ہم سری بھی نہیں کرسکتا۔ جو فوج میدان میں نروس ہوگئی وہ میدان میں کیسے کھڑی رہ سکتی ہے اسی بناء پر سربراہوں کی پہلی کوشش ہوتی ہے کہ وہ فوج کے حوصلے کو قائم رکھیں۔ اور اگر حوصلہ باقی نہیں ہے تو سارے ساز و سامان اور اسلحے بیکار ہوجائیں گے۔ تعجب ہے ہمارے دانشوروں پر یہ نکتہ کیسے پوشیدہ ہے ایک طرف محکوم اور مغلوب بن کر زندہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ رونا روتے ہیں کہ مسلمان ہر میدان میں پیچھے ہورہے ہیں مرعوب اور محکوم ذہنیت کے لوگ پیچھے نہیں تو آگے کیسے رہیں گے!

ذیل کی آیت پر غور کیجئے! کیا پیغام دے رہی ہے امت مسلمہ کے لئے کونسی منزل کا تعین کرتی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّھُمۡ صٰغِرُوۡنَ. (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

ان آیات پر ادنیٰ تامل سے یہ بات ظاہر ہوجائے گی کہ مسلمان ملت کو جس منصب پر فائز کیا گیا ہے اور اس کے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ مسلمان اپنی قائدانہ حیثیت کو ہمیشہ اپنے ذہن و دماغ میں مستحضر رکھیں اور کسی وقت بھی مغلوبیت، محکومیت اور تابعداری کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں ورنہ وہ نہ عدل وقسط کی گواہی دے سکتے ہیں نہ ہزیمت اور پسپائی کی دلدل سے نکل سکتے ہیں اور نہ کفار ومشرکین سے جزیہ وصول کرنے کی پوزیشن میں ہوسکتے ہیں بلکہ دوسروں کے ہمیشہ باجگزار بن کر رہیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے برادر محترم کو یہی دوسری حالت زیادہ پسند ہے۔ لیکن کیوں پسند ہے اس کا جواب اک راز سربستہ ہے جس کو شاید وہ سمجھ رہے ہوں لیکن دوسروں کو سمجھا نہیں سکتے۔

پھر دیکھئے اللہ نے اپنے رسول کو کتاب دے کر بھیجا کس مقصد کے لئے؟ کیا وہ مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو کفر وشرک کی ظلمات سے نکال کر دین حق کی روشنی میں لائیں اور ادیان باطلہ پر دین حق کو غالب کردیں۔ سوچیۓ اللہ کے رسول ﷺ نے اس زمین پر کیا کارنامہ انجام دیا۔ وہ کارنامہ اس کے سواء کیا تھا کہ آپ ﷺ نے خدا کے بندوں کو خدا کے سامنے جھکایا اور انسانی زندگی پر قرآنی نظام قائم کیا اور تمام غیر اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کا خاتمہ کردیا۔ اس کے لئے آپ ﷺ نے جہاں افہام وتفہیم اور دعوت وتبلیغ سے کام لیا وہیں اسّی سے زیادہ مواقع پر آپ ﷺ نے لشکر بھی ترتیب دیا اور اٹھائیس[۲۸] بار آپ ﷺ بذات خود میدان جنگ میں آئے اور صرف کمان نہیں کی بلکہ کمان کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی کی طرح لڑے اور زخم کھائے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا اس کی آپ کیا توجیہ کریں گے؟

آج اگر مسلمان اپنے نبیؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق دنیا کی قیادت ورہنمائی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور اس منصب پر پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے کچھ تگ ودو کرتے ہیں تو وہ کیونکر قابل تنقید اور لائق ملامت ہیں؟ لائق ملامت تو وہ ہیں جو وقت کے نمرود، فرعون اور ابوجہل کے سامنے سرنگوں ہوکر زندگی گزار لینے کو ہی حاصل زندگی اور کمال زندگی سمجھتے ہیں۔ جو باطل نظریات اور ان کے علمبرداروں کی واہ واہ کرتے ہیں لیکن حق کے علمبرداروں پر اپنے تیرونشتر چلانے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کرتے۔ مسجد کے حق میں ایک لفظ بھی نہ بول کر مندر کے لئے فضاء ہموار کرتے ہیں۔ اہل حق کو چھوڑ کر باطل کے ایجنٹوں کی تائید میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ حسن البناؒ، قطب شہیدؒ، مودودیؒ

اور ابوالحسن علی ندویؒ پروار پروار کرتے ہیں لیکن ارون شوری، کلدیپ نیئر اور اڈوانی کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور پوری ملت کو ان کے چرنوں میں گرنے کیلئے ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے واسطے اپنی ساری صلاحیتوں کو لگادینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ کھلی آنکھوں دیکھی جانے والی چیز ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے کسی کے تابع اور محکوم بن کر زندہ رہنا گوارا نہیں کیا بلکہ زندگی اس انداز میں گزاری کہ لوگوں کو اپنی قیادت میں چلائیں اپنی بات منوائیں اور اپنے حکم کے سامنے لوگوں کو جھکائیں۔ تو سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کے جانشین اور نبی ﷺ کے امتی اسوۂ رسول کو چھوڑ کر دوسروں کے تابع اور محکوم کیسے بن کر کے رہیں گے؟ لیکن پھر بھی اگر کوئی مسلمانوں کو کسی کی تابعداری اور محکومیت قبول کرنے کی تلقین کرتا ہے تو اس کو اسوۂ رسولؐ سے کیا نسبت ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ہر شخص اپنے دل میں سوچ لے۔

صحابیٔ رسول ﷺ کا قول

اب آیئے ایک صحابیٔ رسول کے قول پر ہم گفتگو کریں حضرت ربعی بن عامرؓ کی بات سے خود یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اس وقت ایران میں اللہ کی عبادت کے بجائے انسانوں کی عبادت ہو رہی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عبادت کیا تھی؟ اس سوال کے جواب میں دو باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انسانوں کی عبادت سے مراد بتوں کی پوجا ہے تو اس صورت میں اگر عام انسانوں کو بت پرستی سے روکنے کے لئے حکمرانوں کو زیر کرنا ضروری ہوتو اس کے لئے جنگ کے سواء دوسرا راستہ کیا ہوسکتا ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جنگ دینی عمل اور مطلوب عمل ہوگی یا محض سیاسی اور نامطلوب عمل؟ اس سوال کا جواب بالکل صاف ہے کہ لوگوں کو بتوں کی عبادت سے روکنے کے لئے جو کارروائی بھی کی جائے گی اس کو نامطلوب اور غیر دینی عمل نہیں کہا جاسکتا ورنہ ایران میں صحابۂ کرامؓ نے جو جنگ کی نعوذ باللہ وہ ایک نامطلوب، سیاسی اور غیر دینی عمل ٹھہرے گا۔ دوسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ انسانوں کی عبادت سے مراد کچھ انسانوں کی قہاری اور جباری میں عام لوگوں کا غلام بن کر رہنا ہے تو اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ انسانوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف لانے کا مطلب لوگوں کو دین حق کے ماتحت کرنے کے سواء کیا ہوگا؟

''توسیعی انسانیت'' کیا چیز ہے اور اس کا مفہوم کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت چونکہ برادر محترم

نے نہیں کی ہے اس لئے ہم اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ ہم نے مانا کہ ایرانیوں سے جنگ ایک اضافی چیز تھی تو ایک اضافی عمل اگر صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے تو اس کے کرنے میں کیا قباحت ہے اور وہ کیوں بے سود ہے؟ اور وہ کیوں لائق ملامت ہے؟ لیکن جہاں تک جنگ کے اتفاقی ہونے کی بات ہے تو یہ بات بھی بالکل غلط اور نا قابل تسلیم ہے اس لئے کہ اتفاقی کہنا اس وقت صحیح ہوتا جب جاتے جاتے ناگہانی طور پر مڈبھیڑ اور ٹکراؤ ہو جاتا۔ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ بالقصد صحابہ کرامؓ گئے تھے اور پورے پلان کے ساتھ جا کر وہاں کہا تھا کہ ایسا ایسا کرو اور نہیں تو میدان میں آؤ۔ آخر اس کو اتفاقی واقعہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ اس طرح کے واقعات تاریخ اسلام میں مسلسل ملتے ہیں۔

ان پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ برادر محترم ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے اور جس کے لئے نہ کتاب و سنت سے کوئی دلیل مل سکتی ہے اور نہ تاریخ اسلامی سے۔ بس ایک مفروضہ ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے زور قلم دکھایا جا رہا ہے اس موقع پر برادر محترم کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں عمومی مساوات، اخوت و محبت اور انسانیت کی ٹھنڈی ہوائیں چلانا ایک اضافی عمل ہے اور اصل مقصود کا لازمی نتیجہ ہے اصل مقصود توحید ربوبیت اور توحید الہ ہے جس کو کسی حال میں نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ پس پشت ڈالا جا سکتا ہے یعنی اخوت و محبت کے لئے توحید کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی نبی نے اخوت و محبت اور قومی یکجہتی کے حصول کے واسطے توحید اور توحید کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا یا اس سلسلے میں کسی مصالحت، مداہنت اور نرمی سے کام لیا ہو۔

بعض مواقع پر برادر محترم نے اضافی اور مقصود کی دو تقسیمیں کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ لوگ سطح پر ہیں اور میں بہت گہرائی میں پہنچا ہوا ہوں۔ مثلاً موصوف انابت اور توکل کو مقصود اور دوسری چیزوں کو اضافی یعنی غیر مقصود کہتے ہیں۔ حالانکہ بعض انہیں باتوں کا نہ ہونا عدم ایمان قرار دیا جاتا ہے جیسے جہاد میں شرکت نہ کرنا، اللہ، رسول کے فیصلے کو نہ ماننا، اور طاغوت کے پاس اپنا مقدمہ لے جانا وغیرہ اس چیز کو ایک اور پہلو سے دیکھئے اسی طرح کی ذہنیت کی بناء پر کئی لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو بھی اضافی قرار دے کر دل کی نماز پڑھتے ہیں حتّٰی کہ جمعہ کی نماز میں بھی شرکت نہیں کرتے کہ اصل مقصود تو اللہ سے تعلق ہے اس کو دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے اور اس کا وصال حاصل کرنا ہے وغیرہ ذلک۔ اس اعتبار سے اضافی اور غیر اضافی کی تقسیم ایک گمراہ کن تقسیم ہے کیونکہ اصل چیز رضائے الٰہی کے حصول کیلئے سنت رسولؐ کے مطابق جہد و عمل ہے۔

گڈ مسلم اور گڈ انڈین

برادر محترم بڑے دعوی کے ساتھ لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کی طرف سے یہ مسئلہ بار بار مختلف صورتوں میں اٹھایا گیا ہے۔ انگلش میگزین سنڈے (۱۹۔۲۵ر نومبر ۱۹۹۵ء) میں مسٹر ارون شوری کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ایک شخص اگر گڈ مسلم ہے تو وہ گڈ انڈین (یا گڈ فرنچ، گڈ جرمن) نہیں ہوسکتا۔

۲۸ر نومبر ۱۹۹۵ء کو میں نے یہ انٹرویو پڑھا۔ اس کے فوراً بعد میں نے مسٹر ارون شوری کو ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسی بات آپ نے کہہ دی۔ آپ کی تعریف کے مطابق، میں گڈ مسلم ہوں مگر اسی کے ساتھ میں ایک گڈ انڈین بھی ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو سارے ملک میں کوئی بھی شخص گڈ انڈین نہیں۔ حتی کہ میں کہوں گا کہ اگر کوئی شخص مجھ کو گڈ انڈین نہ مانے تو اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

مسٹر ارون شوری نے فوراً اس کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ پورے معنوں میں ایک گڈ انڈین ہیں۔ میں نے اپنے انٹرویو میں آپ کا نام لے کر آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ مگر میگزین والوں نے میرا پورا انٹرویو نہیں چھاپا۔

مگر سوال کسی ایک فرد کے گڈ انڈین ہونے کا نہیں ہے بلکہ اصول کا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ایک شخص اچھا مسلمان ہوتے ہوئے کیا اچھا انڈین یا اچھا فرنچ بن سکتا ہے یا نہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۸۱)

یہاں ذرا بھی معروضی انداز سے جو سوچے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ارون شوری صحیح ہے اور ہمارے برادر محترم غلط ہیں ہم برادر محترم سے سوال کریں گے کہ فرض کیجئے دستور ہند کی روشنی میں ملک کی عدالت عالیہ سپریم کورٹ یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا فیصلہ کر دے یا قرآن پر بین لگا دے یا انڈین فوج اسرائیل سے مل کر مکہ و مدینہ پر حملہ کر دے تو ظاہر ہے ایک گڈ مسلم اور ایک گڈ انڈین دونوں کا فرض اور رول ایک نہیں ہوگا۔ ایک گڈ مسلم ان تینوں فیصلوں کے خلاف جائے گا اور ایک گڈ انڈین ان تینوں کی تائید کرے گا۔

آپ کو یہ سمجھنا چاہئے کہ دو متضاد چیزیں معمول کے حالات میں ایک ساتھ چلتی ہیں اس کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جانا چاہئے کہ یہ متضاد نہیں ہیں۔ متضاد تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ کسی وقت یہ دونوں کی راہ الگ الگ ہوسکتی ہے۔ حقیقت پسندی کا یہی تقاضا ہے۔

ارون شوری کے خیال میں گڈ انڈین وہ ہوگا جو وطن پرست ہو۔ لیکن ایک گڈ مسلم وطن دوست ہوگا۔ وطن پرست نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی اپنے وطنوں سے ہجرت اس کے لئے شاہد عدل ہے۔

عالمی قومیت

برادر محترم تحریر کرتے ہیں......

''انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں سیاسی ضرورت کے تحت، نہ کہ شرعی تقاضے کے تحت ساری مسلم دنیا میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے مسلمانوں کو یہ ذہن دیا کہ اسلام ایک عالمی قومیت ہے اور مسلمان اس عالمی قومیت کے بین الاقوامی شہری ہیں پان اسلام ازم، خلافت تحریک، عالمی حکومت الٰہیہ، خدام کعبہ، الاخوان المسلمون، تحریک پاکستان وغیرہ سب نے کسی نہ کسی اعتبار سے مسلمانوں کے اندر اسی قسم کا ذہن بنایا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ذہن آج شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی ہے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ:۱۷)

شرعی تقاضے اور سیاسی ضرورت میں کیا کوئی ایسا تضاد ہے کہ یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے؟ حالانکہ ایک ہی چیز سیاسی ضرورت بھی ہو سکتی ہے اور شرعی تقاضا بھی۔ مثلاً کسی مقام پر مسجد کو منہدم کرنے کے لئے کچھ لوگ جمع ہو جائیں تو شرعی تقاضا ہوگا کہ مسجد کے تحفظ کے لئے کمر بستہ ہوا جائے اور سیاسی ضرورت بھی کہ اگر اس موقع پر ہم چپکے بیٹھے رہیں گے تو دوسری اور تیسری مسجد بھی گرا دینے کی ہمت ہو جائے گی۔ کسی مسجد میں نماز سے روکا جا رہا ہو تو شرعی تقاضا بھی ہے اور سیاسی ضرورت بھی کہ حتی المقدور نماز پڑھنے کی کوشش کی جائے ورنہ ہماری کمزوری سے مخالفین کی ہمت مزید بڑھ جائے گی۔ پھر کیا سیاسی ضرورت کو شرعی تقاضا نہیں بول سکتے۔

طواف کعبہ میں رمل کی سنت کو آپ شرعی تقاضہ کہیں گے یا سیاسی ضرورت؟ دشمن کے نقل و حرکت کی خبر پا کر آپ ﷺ فوجی دستہ ''سریہ'' روانہ کرتے تھے اس کو آپ کس خانہ میں رکھیں گے۔ دشمن کے تعاقب میں سستی نہ کرو۔ اسی طرح جہاد و قتال کے احکام نیز شریعت اسلامی میں حدود و تعزیرات کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟ وہ شرعی تقاضے ہیں یا سیاسی ضرورت؟ الغرض زندگی میں بہت مواقع پر سیاسی ضرورت کو پورا کرنا شرعی تقاضا ہوتا ہے اس لئے سیاسی ضرورت کا نام دے کر کسی بات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عالمی اخوت کا ذہن اور تصور ہے وہ انیسویں اور بیسویں صدی کا ذہن نہیں ہے بلکہ یہ ذہن اسی دن پیدا کر دیا جاتا ہے جس دن آدمی کلمہ پڑھتا ہے۔ قرآنی آیت پر غور کیجئے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(الحجرات:۱۰)

ترجمہ: مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس میں کوئی استثناء ہے یا کوئی قید لگی ہے کہ صرف ہندی مسلمان بھائی بھائی ہیں پاکستانی اور ایرانی اس برادری سے خارج ہیں یا صرف عرب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور دوسرے ملکوں کے مسلمان الگ ہیں۔ ظاہر ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بتایا ہے۔ کیا عالمی قومیت نہیں ہے؟

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سب کے سب جسد واحد کے مانند ہیں۔ جس طرح جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک مسلمان کی تکلیف کو دوسرے مسلمان محسوس کریں۔ خواہ ان میں کا ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں۔ معلوم ہوا کہ ملت اسلامیہ کی وحدت دریا، پہاڑ اور مختلف ملکوں کی سرحدیں نہیں ختم کرسکتیں اور اگر ان وجوہ سے کوئی ملت اسلامیہ میں تفریق کرتا ہے تو وہ شرعی اور اسلامی لحاظ سے ناقابل اعتبار اور غلط ہے۔ اسلام ایک عالمی قومیت ہے۔ اس نظریہ سے اگر آج نظریات ٹکرا رہے ہیں تو کیسے ضروری ہو گیا کہ اپنا نظریہ چھوڑ کر موجودہ نظریات کو قبول کر لیا جائے۔ سیدھی سی بات ہے قومیت کے بہت سارے نظریات ہو سکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کے لئے صحیح طرز عمل یہ ہوگا کہ جہاں تک اسلام کے عالمی اخوت سے ٹکراؤ نہ ہو وہاں تک ان کا بھی لحاظ کرے۔ اور جہاں یہ سوال پیدا ہو جائے کہ آپ وطنی قومیت میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا اسلامی قومیت میں تو آدمی اسلامی قومیت میں شامل رہنے کی بات کہے۔ الغرض وطنی قومیت کو تسلم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بشرطیکہ اسلام کی عالمی قومیت کی نفی نہ ہو۔

جو کوئی ملت اسلامیہ کو ایرانی۔ تورانی اور افغانی کے خانوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اس کو اپنے قلب و نظر کے سارے گوشوں پر خود ناقدانہ نظر ڈال کر جائزہ لینا چاہئے کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ جن کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں ان کی ہر بات کو لازماً لائق ملامت ٹھہرائیں۔

سیاست کی اہمیت

''قدیم زمانہ کے حالات میں صرف پولیٹکل ایمپائر ہی اصل اہمیت رکھتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے عالمی سطح پر اپنا ایک پولیٹکل ایمپائر بنایا مگر موجودہ زمانہ میں سیاست اور حکومت کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ اب دوسری غیر سیاسی چیزوں نے اہمیت اختیار کر لی ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مصلحین اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان پر اپنا سر ٹکراتے رہے۔ جب کہ عین اسی وقت ان کے لئے دوسرے مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ زیادہ طاقتور انداز میں دعوہ ایمپائر بنانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۲۷-۲۸)

یہ ماضی اور حال دونوں کا ناقص ہی نہیں سراسر غلط مطالعہ ہے اس لئے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شعبہ سیاسی شعبہ ہے۔ سیاست اور حکومت جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی کی بالا دستی ہر شعبۂ زندگی میں ہوتی ہے اور اسی کو غالب کہا جاتا ہے اور بقیہ لوگ مغلوب اور محکوم ہوتے ہیں۔ کیا یہ کوئی سوچ سکتا ہے کہ سیاسی بالا دستی کے بغیر کسی ملک میں سوشلزم، کمیونزم یا کسی دوسرے نظام کو قائم کیا جاسکتا ہے؟ اسی طرح سیاسی غلبہ کے بغیر ملک میں سودی نظام کے بغیر اسلام کا معاشی نظام جاری کیا جاسکتا ہے؟ موجودہ زمانہ میں کمیونیکیشن کے جدید ذرائع داعی حق کیسے استعمال کرسکتا ہے؟ جبکہ شیطان کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں سیاست اور حکومت کی باگ ڈور ہے۔ انڈسٹری کو آزاد کہا جاتا ہے لیکن کیا جائز اور حلال دائرے میں رہ کر کوئی اس میدان میں کوئی بڑی کامیابی حاصل کرسکتا ہے؟ سیاسی ادارہ کے بغیر ایسی یونیورسٹیاں کیسے بنائی جاسکتی ہیں؟ جو ساری دنیا کے لئے علوم الٰہی کا سرچشمہ بن جائیں۔ ایسے ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن کیسے قائم کئے جاسکتے ہیں؟ جہاں سے بیک وقت اہل عالم کو خطاب کیا جائے؟ ایسا اقتصادی ہاؤز کیسے بنایا جاسکتا ہے جہاں سے تمام اسلامی سرگرمیوں کو اپنی بنیاد پر جاری کیا جاسکے؟ جدید طرز کے اسپتال، جدید طرز کے رفاہی ادارے، معذور افراد کے لئے جدید معیار کی سہولتیں اور اس قسم کے دوسرے کام کسی حکومت کے اشتراک اور تعاون کے بغیر اعلیٰ ترین سطح پر کیسے کئے جاسکتے ہیں؟ یہ باتیں تو دور کی ہیں آپ ایک ''الرسالہ'' اور چند کتابیں بھی شائع نہیں کرسکتے اگر کسی صاحب اقتدار کی نوازش نہ ہو۔

معیار صحیح و غلط

''اورنگ زیب عالمگیر نے مختلف طاقتوں سے ٹکراؤ کیا تو اس کے سامنے اسلام کا صرف یہ حکم تھا کہ اسلام دشمن طاقتوں کو زیر کرو۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مرہٹوں کے خلاف جہاد کی اسکیم بنائی۔ سید احمد شہید بریلویؒ نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ علماء دیوبند نے انگریزوں سے جہاد بالسیف کیا۔ اس طرح کے تمام واقعات اسلام کے حکم ''دشمنوں سے مقابلہ کرو'' سے مستنبط کئے گئے تھے۔

اسی طرح اقبال کا علیحدہ مسلم اسٹیٹ کا نظریہ اور تقسیم کے بعد اٹھنے والی مسلم پرسنل لاء تحریک، بابری مسجد تحریک اس قسم کی تمام تحریکیں تحفظ شریعت کے حکم سے اخذ کی گئی تھیں مگر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے لئے اس کلی اجتہاد کی ضرورت تھی جو مجموعی مصالح شرعی کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ مگر تمام مصلحین صرف جزئی استنباط کی حد تک پہنچ سکے۔ وہ شریعت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر کلی استنباط یا کلی اجتہاد کا ثبوت نہ دے سکے، اس لئے نہ ان کا استنباط مطابق حال تھا اور نہ وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ ۲۵-۲۶)

یہاں برادر محترم کو جو چیز بتانی چاہئے تھی اس سے پہلو بچا کر نکل گئے۔ بتانا یہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ، اور علماء دیوبند نے اسلام کے حکم ''دشمنوں سے مقابلہ کرو'' سے مستنبط کیا۔ اس میں غلطی کیا ہے؟ غلطی تو اس وقت ہوتی جب وہ غیر اسلام کے کسی حکم سے استنباط کئے ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان بزرگوں نے استنباط نہیں کیا۔ استنباط کرنے کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں کوئی حکم موجود نہ ہو۔ یہاں تو دشمنوں سے لڑنے کا صریح حکم موجود تھا اور ہے۔ ان بزرگوں نے اس پر صرف عمل کیا۔ اگر یہ غلطی ہے تو واقعی انہوں نے غلط کیا۔ اسی طرح تحفظ شریعت کا حکم بھی موجود ہے جس کا آں محترم کو اعتراض ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ بزرگان دین اور برادر محترم کے نقطہ نظر میں فرق یہ ہے کہ جناب کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار دنیاوی فائدہ کے اعتبار سے کسی نتیجہ کا حاصل ہونا ہے جبکہ بزرگان دین کے نزدیک معیار اور کسوٹی کتاب وسنت کے مطابق ہونا ہے خواہ دنیا میں اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسی چیز کا نام استقامت ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور کسی ایک واقعہ یا کسی ایک شخصیت کے ڈر سے نہیں ہوا۔ جیسا کہ برادر محترم کا خیال ہے کہ گاندھی جی کے اجتہاد نے انگریز کو بھگایا۔ نہیں، انگریز کے جانے کا اصل سبب وہ جہد مسلسل ہے جس کی آخری علامت علماء دیوبند کی قربانیاں ہیں جہاد مسلسل کا تسلسل اگر نہیں ہوتا تو یہ منزل ہرگز نہیں آتی کہ انگریز ہندوستان کو گاندھی جی اور مسٹر جناح کے حوالے کر دیتے۔

اسلام کا اصل مقصد

> ''اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا کو بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا، اسلام کا اصل مقصد اظہار ہے، اسلام کا اصل مقصد اقتدار نہیں۔ اسلام کا منشا نظریاتی غلبہ ہے نہ کہ محض سیاسی غلبہ۔ اسلام کا اصل مقصود جنت ہے، اسلام کا اصل مقصود حکومت نہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۲۹)

یہ یہاں کھلے طور پر برادر محترم کی ذہنی بیماری ظاہر ہو رہی ہے اسلام کا مقصد دل کا بدلنا بھی ہے اور ہاتھ پیر اور پورے اعضاء وجوارح کو بدلنا بھی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے اس کا مقصد مکمل تبدیلی ہے وہ پوری زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے انسانی زندگی کا نجی شعبہ ہو یا خاندانی، معاشرتی ہو کہ سیاسی سب پر اسلام اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حکمرانی چاہتا ہے ہر جگہ سے منکرات اور منکرات کے ایجنٹوں کو نکالنا چاہتا ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ اصل مقصود حکومت ہے مقصود حکومت نہیں ہے۔ لیکن اصل مقصود کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے وضو مقصود نہیں ہے لیکن وضو کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی اسی لئے وضو فرض ہے۔ معرکہ بدر وحنین مقصود نہیں تھے لیکن فتح مکہ کے لئے ضروری تھے۔ پھر فتح مکہ بھی مقصود نہیں تھا مگر تطہیر کعبہ کے لئے فتح مکہ لازمی تھا۔ نیز تطہیر کعبہ بھی مقصود نہیں لیکن رضاء الٰہی کے لئے کعبہ کو پاک کرنا لازمی تھا۔

جوگیوں، راہبوں اور سادھوؤں کی طرح اگر صرف دل کی دنیا ہی بدلنی ہوتی تو تاریخ دعوت وعزیمت بار بار دہرانے کی ضرورت نہ پڑتی اور اللہ کے پیارے نبیؐ غار حرا سے نہ نکلتے، مکہ میں قریش کی گالیاں نہ کھاتے، طائف میں پتھر کھانے کی نوبت نہ آتی اور بدر وحنین کے معرکوں میں شریک نہ ہوکر دنیا کا لطف اٹھاتے۔

برادر محترم اپنے اسی ذہنی مرض کے بناء پر ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

> ''اب اگر کسی مقام پر اہل اسلام کو حکومتی ادارے میں غلبہ حاصل نہیں ہے تو اس پر انہیں کچھ ملال کرنے کی ضرورت نہیں۔''

گویا آں محترم کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمان ذلت اور پستی کی حالت میں ہوں خدا اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے بجائے طواغیت انس وجن اپنی خرافات پھیلا رہے ہوں، قرآن وسنت پر مبنی احکام وقوانین کے بجائے کفر وشرک وزندقہ والحاد کا دور دورہ ہو تو مسلمانوں کو کسی طرح کا ملال نہیں کرنا چاہئے۔ کیا سوچ ہے اللہ رے توبہ! شیطان کا بڑے سے بڑا ایجنٹ بھی کیا اس دھڑلے سے اس طرح کی نصیحت مسلمانوں کو کرنے کی جرات کرے گا؟

یہ کیا ذہنیت ہے!

برادر محترم تحریر کرتے ہیں:

> ''پروفیسر مشیر الحق یکم راگست 1933ء کو یوپی کے ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے 15 راپریل 1990ء کو انہیں سری نگر میں شہید کر دیا گیا۔''

ہمیں پروفیسر مشیر الحق کو شہید کہنے پر کوئی اعتراض نہیں اللہ ان کی شہادت کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ کشمیر میں اپنی آزادی کیلئے لڑنے اور مرنے والوں کو دہشت پسند کا لقب دیا جاتا ہے اور سید احمد بریلوی کے ساتھیوں کیلئے ہلاکت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے؟ آخر یہ کیا ذہنیت ہے؟ چنانچہ فرماتے ہیں:

> ''یہ فتویٰ جاری رہا یہاں تک کہ 1831ء میں سید احمد بریلویؒ نے اپنے ساتھیوں کو لیکر عملی جہاد کیا جس میں تمام کے تمام لوگ ہلاک ہوگئے'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۴۰)

اقوام متحدہ

> ''علماء اپنی غیر مجتہدانہ سوچ کے تحت صرف ایک ہتھیار کو جانتے تھے اور وہ تشدد کا ہتھیار تھا۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ ان کی جدوجہد آزادی کے لئے موجودہ زمانہ میں ایک عظیم تر نظریاتی ہتھیار وجود میں آچکا ہے۔ یہ ہتھیار وہ ہے جس کو حکومت خود اختیاری (Self Determination) کہا جاتا ہے۔ یہ تصور اٹھارویں صدی کے فرنچ

ریولیوشن کے دوران ظہور میں آ چکا تھا۔جس نے قوموں کو یہ حق دیا کہ وہ تشدد کا استعمال کئے بغیر محض دلیل کی پرامن طاقت سے قومی آزادی کی موثر جدوجہد کر سکیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد 1919ء میں بننے والی جمعیت اقوام League of Nations کے متعلق مسلمانوں کے رہنما علامہ اقبال صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ کفن چوروں کی انجمن ہے جو قبروں کی تقسیم کے لئے منظم کی گئی ہے۔

چیست جمعیت اقوام کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور را انجمنے ساختہ اند

مگر اصل حقیقت ہے کہ جمعیت اقوام نے پہلی بار انٹرنیشنل تصدیق سے یہ سیاسی معیار طئے کیا کہ ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے درمیان اپنی مرضی کی حکومت قائم کرے۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد 1945ء میں جب اقوام متحدہ United Nations بنائی گئی تو تمام قوموں کے اتفاق رائے سے یہ اصول آخری طور پر ایک مصدقہ سیاسی اصولوں کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

مہاتما گاندھی نے عالمی سیاست کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ان زمانی تبدیلیوں سے آگاہ تھے چنانچہ وہ ساؤتھ آفریقہ سے ہندوستان آئے اور اپنے ''سیکولر اجتہاد کے ذریعہ ہندوستان کے عوام نیز علماء کو بتایا کہ ہمیں اب تشددانہ ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ''حکومت خود اختیاری'' کے نظریاتی ہتھیار کو ہم زیادہ موثر طور پر اپنے حق میں استعمال کر سکتے ہیں چنانچہ علماء کی مقلدانہ رائے پر گاندھی جی کی مجتہدانہ رائے برتر ثابت ہوئی اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ اب تمام لوگوں کے لئے ایک معلوم تاریخ بن چکا ہے۔ (فکر اسلامی، صفحہ:۴۱-۴۲)

مذکورہ بالا لمبا اقتباس پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجئے:

① ''حکومت خود اختیاری'' کا ہتھیار وجود میں آ جانے کے بعد ایسا کیوں نہیں ہوا کہ تمام ممالک نے اپنی فوجوں کو ختم کر دیا ہو۔ بلا وجہ ہر ملک اپنی قومی دولت کا ایک بڑا حصہ فوجوں اور ہتھیاروں پر خرچ کرتا ہے اسی طرح یہ کیوں نہیں ہوا کہ دنیا کی نظریاتی، طبقاتی، وطنی اور مذہبی گروہوں نے اپنی جدوجہد اور تگ ودو روک دی ہو۔

② جمعیت اقوام ہو یا اقوام متحدہ ہو ان کے اصولوں نے دنیا کے کتنے مسائل حل کئے ہیں اور کتنے کمزوروں کو انہوں نے ان کا حق دلایا ہے؟

③ کوئی ایسی مثال دیجئے کہ جس کے پاس قوت مدافعت نہیں تھی لیکن اقوام متحدہ کے اصولوں نے اس کا حق دلایا ہو۔ افغانستان سے حملہ آور روس کو قوت نے بھگایا یا دلیل نے؟ اس کے بعد بوسنیا، چیچنیاء کو جو آزادی بھی ملی ہے کیا دلیل کی بنیاد پر ملی ہے؟ افغانستان سے شکست کھا کر روس کے ٹوٹنے سے پہلے

اقوام متحدہ کے اصول اور دلائل کہاں تھے؟ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہیں ہوگا کہ برادر محترم کی یا تو یہ سادہ لوحی ہے یا پھر کسی اسلام دشمن قوت کے شکار ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی بے سر و پیر کی باتیں مسلمانوں کے ذہنوں میں بیٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ذرا بھی آگے پیچھے نہیں سوچ رہے ہیں اور اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔''

④ قرآن خدا کی آخری کتاب ہے قرآن میں قوت اور طاقت استعمال کرنے کی بار بار تاکید آئی ہے باطل اور اہل باطل کو دبانے یا مٹانے کیلئے۔ کیا اس طرح کے احکام اقوام متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد کالعدم ہو گئے ہیں اور ''قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ'' اور ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ'' جیسی آیات منسوخ ہو گئی ہیں؟ اور کیا اب مسلمان خیر امت کے لقب کو، اس کے مقتضیات کو اور ''وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ'' کے تصور کو اپنے ذہن و دماغ سے کھرچ کر نکال دیں اور ہاتھ پیر توڑ کر بس بیٹھ جائیں کہ اب اقوام متحدہ کے امن چارٹ کے وجود میں آنے کے بعد کسی عملی جد و جہد کی ضرورت نہیں ہے۔

امام اور قائد کی حیثیت

''انیسویں صدی میں جب مغربی قومیں نئی طاقت سے مسلح ہو کر ابھریں اور انہوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو مغلوب کر لیا تو تمام دنیا کے مسلم دانشور ''نحن خلفاء اللّٰہ فی الارض'' (ہم زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں) کے اسی تصور میں سرشار تھے۔ وہ اپنی صرف ایک شناخت جانتے تھے اور وہ یہ کہ وہ زمین پر امام اور قائد کی حیثیت سے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ صورت حال آج تک پوری طرح باقی ہے ایک شاعر کے الفاظ میں اس فکر کا خلاصہ یہ ہے:

جس طرح احمد مختارؐ ہیں نبیوں میں امام
ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

اس ذہن کی بناء پر مسلم علماء اور دانشوروں کو کرنے کا ایک ہی کام نظر آیا۔ یہ کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی حاکمانہ حیثیت کو دوبارہ حاصل کریں۔ پچھلے تقریباً دو سو سال سے کسی نہ کسی صورت میں یہ جد و جہد جاری ہے۔ مگر ان گنت قربانیوں کے باوجود اس میدان میں مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۴۴)

یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے کہ مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے اندازہ کیجئے اگر مسلمانوں نے ان گنت قربانیاں نہ دی ہوتیں اور آں محترم کے نظریہ کے مطابق بالکل سرنگوں ہو گئے ہوتے اور مخالف قوتوں کے مقابلہ میں سپر ڈال دی ہوتی تو آج ان کے زوال اور پستی کی کیا انتہاء ہوتی اس کا تصور کیجئے۔ آج ان کی جو بھی بچی

کچھی ساکھ ہے انہیں قربانیوں کے صلہ میں باقی ہے۔اسی طرح مسلمانوں کے اندر اپنے امام اور قائد ہونے کے بجائے دوسروں کا خوشہ چیں، دوسری قوموں کا مقتدی اور دوسرے لیڈروں کے پیروکار بن جانے کا تصور عام ہوجاتا، اور احساس کمتری اور پسماندگی کا شکار ہوگئے ہوتے تو اس وقت ان کا کیا حال ہوتا؟

جہاں تک دعوت کا سوال ہے تو دعوت کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ داعی اپنی دعوت اور پیغام کو سارے نظریات اور عقائد سے اونچا اور فائق سمجھے اور دوسرے سارے نظریات کو غلط، بے بنیاد اور انسانیت کے لئے مہلک اور خسارے کا باعث جانے۔اسی کے ساتھ اہل حق کو اہل باطل کے مقابلے میں اہمیت اور عزت واکرام کے لائق تصور کرے مگر یہ دو چیزیں کسی کے اندر نہیں ہونگی تو وہ کیا دعوت دے گا اور کس چیز کی دعوت دے گا؟ انبیاء علیہم السلام اللہ کی بندگی اور اپنی اطاعت کی دعوت دیتے تھے اگر وہ صرف اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے اور اپنی اطاعت کرانے کے بجائے باطل عقائد کے پیشواؤں اور لیڈروں کے مقتدی اور پیروکار رہنے دیتے تو ان کی دعوت کا کون نوٹس لیتا؟ نیکی اور بدی، صالح اور غیر صالح کے امتیاز اور فرق کا کہاں منظر سامنے آتا؟

نہیں معلوم کس دلیل اور کس محرک کے تحت برادر محترم کو سب سے زیادہ جو چیز ناپسندیدہ اور غلط معلوم ہوتی ہے وہ مسلمانوں کے ذہن میں اپنے امام اور قائد ہونے کا تصور ہے اسی لئے خلیفہ، خلافت اور لفظ شہداء کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو سلف صالحین کی راہ سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں چنانچہ دیکھئے شہداء کے مفہوم میں یقیناً حق کی شہادت کا مفہوم شامل ہے لیکن غور فرمائیے کہ کیا شہادت کا حق صرف قولی شہادت، وعظ وتلقین اور کتابیں تصنیف اور تقسیم کرنے سے ادا ہوجائے گا؟ اور قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت کی ضرورت نہیں ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب اگر یہ ہوگا کہ قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی ضروری ہے تو ظاہر ہے کہ عملی شہادت میں عبادات، اخلاقیات اسلام کے معاشرتی، خاندانی اور سیاسی اصول کی شہادت بھی ضروری ٹھہرے گی۔یہیں سے خلافت کے تصور کا آغاز ہوتا ہے چنانچہ یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب تک نظام خلافت قائم نہیں ہوتا اس وقت تک دعوت اور شہادت حق کا پوری طرح ادا کرنا ناممکن ہے۔اسی لئے فقہائے کرام کہتے ہیں کہ نصب امام یعنی حکومت اسلامیہ کا قیام ایک دینی فریضہ ہے۔

فقہ کی رہنمائی

''اس معاملہ کو مثال سے سمجھئے۔موجودہ فقہ خلافت عباسی کے زمانے میں بنی اس وقت مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ یہ مدون فقہ یہ تو بتاتی ہے کہ مسلمان جب حکمراں حیثیت میں ہوں تو ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں؟ اس میں ایسے ابواب کثرت سے پائے جاتے ہیں۔لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو غیر حکمراں حیثیت میں پائیں، اس وقت ان کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ تو اس کا

واضح جواب آپ کو موجودہ مدون فقہ میں نہیں ملے گا۔

اسی طرح موجودہ فقہ جس وقت مدون کی گئی اس وقت شخصی حاکمیت کا زمانہ تھا۔ موجودہ قسم کی عوامی جمہوریت اس وقت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے فقہ میں خلیفہ اور سلطان سے متعلق احکام تو بہت ملیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان کسی ملک میں تنہا حاکم نہ ہوں البتہ وہ جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ شریک حکومت ہوں ایسی حالت میں ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں تو اس کی بابت بھی موجودہ مدون فقہ میں آپ کوئی رہنمائی نہیں پائیں گے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۴۹۔۵۰)

برادر محترم کو یہ شکایت ہے کہ فقہ میں آداب غلامی نہیں سکھائے گئے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان حاکم ہوں تو کیا کریں لیکن جب محکوم اور غلام ہوں تو کیا کریں نہیں بتایا گیا۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان غلام اور محکوم بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا ہے مسلمان امت زمین پر اللہ کی نمائندہ ہے۔ رسولؐ کی جانشین ہے۔ اسے دنیا کی رہنمائی اور قیادت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ اسے خیر امت کا لقب دے کر نیکیوں کا محافظ، بدیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں اللہ کا وہ سپاہی ہے اسے حزب اللہ کہا گیا ہے اور حزب اللہ کی صفت شیطان کے مقابلے میں اللہ کے لئے لڑنا بتائی گئی ہے ایسی صورت میں کیسے ممکن تھا کہ اسے اچھا غلام بننے اور سچا وفادار اور کسی کا محکوم بننے کی تعلیم دی جاتی۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

دوسری بات یہ ہے کہ کیا فقہ میں دشمنانِ اسلام سے جہاد فرض نہیں قرار دیا گیا ہے؟ کیا فقہ کی کتابوں میں ''کتاب الجہاد'' آپ نے نہیں پڑھی ہے؟ مسلمان دارالحرب میں بحیثیت مستامن یا بحیثیت تاجر یا بحیثیت

قیدی جائے تو وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں۔اس طرح کے مسائل پر آپ کی نظر کیوں نہیں پڑتی ؟

تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے انداز گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت میں آداب غلامی اور آداب محکومی کی تعلیم ضرور دی گئی ہے لیکن فقہ میں وہ درج نہیں ہے اگر ایسی بات ہے تو براہ کرم آپ کو کم ازکم دو چار آداب تو ضرور پیش کرنے چاہئے تھے قرآن کی یہ چند آیات پڑھئے اور بتایئے کہ ان آیات کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان کسی غیر کا کس طرح تابع اور محکوم بن کر رہ سکتا ہے۔(سورۃ الانعام ۱۱۶، الکہف ۲۸، الفرقان ۵۲، الاحزاب ۴۸، القلم ۸، النساء ۲۴، آل عمران ۱۰۰، الشعراء ۱۵۱، سورۂ محمد ۲۶)۔

چوتھی بات یہ ہے کہ کسی جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ مسلمان شریک حکومت ہوں ایسی حالت کے شرعی احکام فقہ میں نہیں تو کیا کتاب وسنت میں بتائے گئے ہیں؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شراب کی دوکان میں شریک ہوکر کاروبار کرنا فقہ میں تو نہیں بتایا گیا ہے لیکن کتاب وسنت میں بتایا گیا۔نعوذ باللہ من ذلک۔ ایک مسلمان اللہ کو حاکم اور آمر مانتا ہے اللہ نے اپنے احکام اور قوانین کو اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ بھیج دیا ہے۔رسول ﷺ اور رسول ﷺ کے اصحاب نے عملاً بتادیا ہے کہ حکومت کیسے کی جائے قانون کیسے بنایا جائے۔ ایسی صورت میں کوئی مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نقشہ کے خلاف چلنے والی حکومت میں کیونکر شریک ہوسکتا ہے؟ اور کوئی فقیہ اس کے جواز کی صورت آپ کو کہاں سے لاکر بتاسکتا ہے؟

اللہ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔مشترک حکومت سود کو حلال کرتی ہے اللہ کی شریعت میں جوا، شراب اور زنا حرام ہیں اور جمہوری حکومت ان کو جائز کہتی ہے۔اللہ نے فرمادیا میرے رسول کے خلاف نہ جاؤ، میرے رسول کی اتباع کرو لیکن مشترک حکومت کہتی ہے اس دور کے فلاں فلاں لیڈر ہمارے لئے نمونہ ہیں اس لئے ایسی حالت میں مسلمان شریک حکومت کیسے ہوسکتا ہے؟!

یہ کہنا سراسر جھوٹ اور افتراء ہے کہ

''مدنی دور کے ابتدائی چند سال وہ ہیں جبکہ ایک صحیفہ کے ذریعہ مسلمان اور یہود یا مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک مشترک نظام بنایا گیا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۵۰)

کیا مدینہ کے اس نظام میں اللہ کے رسول ﷺ ایک لمحہ کیلئے بھی کسی دوسری شخصیت، کسی دوسرے دستور اور کسی دوسرے قانون کے تابع بن گئے تھے اللہ کے دستور وقانون کو چھوڑ کر؟ مدینہ میں دستور نہیں بلکہ ایک معاہدہ طئے ہوا تھا جس میں فیصلہ کی اعلیٰ اور آخری اتھاریٹی اللہ کے رسول ﷺ کو حاصل تھی۔کیا آج جمہوری ملکوں میں مسلمان اسی حیثیت میں شریک حکومت ہیں؟ کہاں کی مثال کہاں دی جارہی ہے افسوس کی بات ہے۔

آج جمہوری حکومتوں میں اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیمات کو تسلیم کرنا اور اس کو آخری سند ماننا تو دور کی بات ہے ان کو کوئی ادنیٰ مقام بھی نہیں دیا گیا ہے چونکہ مدینہ میں اعلیٰ اتھارٹی رسول خدا ﷺ کو تسلیم کیا گیا تھا اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ رسول ﷺ کسی حکومت اور نظام میں شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ معاہدہ کے ذریعہ اپنے نظام میں دوسروں کو شریک بنایا تھا۔ اس نکتہ کو عمداً نظر انداز کر کے عموماً نبی ﷺ کے معاہدات کو غلط طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو من حیث القوم شریک نہیں مانا جاتا بلکہ ملک کے ایک عام شہری کی حیثیت سے شریک مانا جاتا ہے نہ کہ بحیثیت مسلمان۔ بلکہ من حیث القوم انہیں الگ سے کوئی مقام دینے کی کوششوں کو فرقہ پرستی اور علیحدہ پسندی سمجھا جاتا ہے جو دستوری اعتبار سے ایک بھاری جرم ہے۔

شاتم رسول ﷺ

برادر محترم شاتم رسول ﷺ جیسے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جانا چاہئے اس لئے کہ ایسا اس لئے ہو رہا ہے کہ دور جدید میں اظہار رائے کی آزادی دی گئی ہے جو ایک عظیم نعمت ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

> ''اس اعتبار سے دیکھئے تو اظہار رائے کی موجودہ آزادی اہل اسلام کے لئے ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ وہ ہمارے لئے تبلیغ و دعوت کے بند راستہ کو لامحدود طور پر کھول دینے والا ہے اب اگر سلمان رشدی جیسے کچھ مظاہر پیدا ہو رہے ہوں تو ہم کو اسے اس نظر سے دیکھنا چاہئے جس طرح ایک کسان باران رحمت میں کیچڑ کے مسئلہ کو دیکھتا ہے بارش میں اگرچہ بعض اوقات کیچڑ کے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں مگر بارش کے عظیم فائدوں کے مقابلے میں اس جزوی مسئلہ کی کوئی اہمیت نہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۸۶)

اپنے نظریہ کی تائید میں چند باتیں اور بھی کہتے ہیں:

> ''شاتم رسول کے متعلق ابن تیمیہؒ، ابن عابدینؒ اور سبکیؒ وغیرہ کی کتابیں اس وقت لکھی گئیں ہیں جب مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا اور موجودہ دور میں ایک تو مسلمان مغلوب ہیں شاتم رسول کو ختم نہیں کر سکتے۔ دوسرے اس دور کی ایک بڑی قوت میڈیا اسلام کو اس بہانے سے تشدد کا مذہب بنا کر پیش کرتی ہے۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں فتوی پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہیں شاتم رسول جس طرح دور اقتدار میں قتل کئے جانے کے لائق تھا وہ آج بھی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ رہے گا۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ اسے قتل کرنے کی ہمارے اندر طاقت نہیں ہے یا ہم اسے قتل نہیں کر پا رہے ہیں دنیا کے کسی قانون میں ایسا نہیں ہے کہ مجرم پر کسی وجہ سے قانون نہیں لاگو ہو پا رہا ہے تو اسے بے قصور اور قابل نظر انداز قرار دیا جائے یا کہیں کسی قانون کا نام لے

کر مخالفین پروپیگنڈہ کررہے ہوں تو اس قانون کو قانون کی کتاب سے نکال دیا جائے۔قرآن کی کئی آیات کو لے کر اسلام کے خلاف بولنے والے برابر بولتے رہتے ہیں تو کیا ان آیات کو آپ قرآن سے نکال دیں گے؟

برادر محترم اپنی بات کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ شاتم رسول کی سزاء کا حکم مدینہ میں نازل ہوا ہے، مکی دور میں شاتم رسول کے خلاف فتویٰ نہیں دیا گیا اس لئے اس دور میں شاتم رسول پر فتویٰ نہیں لاگو ہونا چاہئے لیکن اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو آج کئی حرام چیزیں حلال ہوجائیں گی اور کئی احکام پر عمل کرنا ضروری نہ رہے گا اور نتیجہ کے طور پر اس دور میں شریعت کے ایک بڑے حصے سے آزادی کا پروانہ مل جائے گا۔

برادر محترم کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

’’حالانکہ واقعات بتاتے ہیں کہ اس معاملہ میں خود اسلام میں حالات کے اعتبار سے فرق کیا گیا ہے چنانچہ ابن تیمیہؒ اور دوسرے حضرات شاتم کی سزاء کے جتنے بھی واقعات کا حوالہ دیتے ہیں وہ سب مدنی دور سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اس دور سے جب کہ اسلام کو با اقتدار حیثیت حاصل ہوگئی تھی اس کے برعکس مکی دور میں جب کہ اقتدار اعلیٰ اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھا ابولہب کی بیوی ام جمیل نے علی الاعلان رسول کو ’’مذمما‘‘ کہا مگر نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاتم کی حد بیان فرمائی اور نہ آپ کے اصحاب دوڑے کہ اس شاتمہ کو قتل کرڈالیں۔‘‘ (فکر اسلامی، صفحہ:۵۹)

اس موقع پر ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ برادر محترم مکی دور کی بات کو پیش کر کے مدنی دور کے صریح حکم کو آج منسوخ کرنے کا حق اپنے لئے تسلیم کرتے ہیں لیکن مفسرین کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ مکی دور کی آیات کو مدنی دور کی آیات سے منسوخ مانیں۔آں محترم فرماتے ہیں:

’’مثال کے طور پر کسی مستند تفسیر کو پڑھئے آپ پائیں گے اس میں صبر اور اعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے مثلاً القرطبی کی تفسیر ’’الجامع لاحکام القرآن‘‘ میں ’’وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ‘‘ کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے ’’ھو منسوخ بقوله فاقتلوا المشركين‘‘ اسی طرح آیت ’’وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ‘‘ کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیات آنے کے بعد وہ منسوخ ہوگئی۔ھی منسوخة بالقتال‘‘۔

(فکر اسلامی، صفحہ:۵۹)

یہ کیسی الٹی بات ہے کہ آں محترم کے نزدیک پہلے والا حکم بعد کے حکم کو منسوخ کرسکتا ہے لیکن بعد کا حکم پہلے والے حکم کو منسوخ نہیں کرسکتا

’’جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے‘‘

دینی لٹریچر

برادر محترم نے اورنگ زیب عالمگیرؒ سے لے کر اس دور کے مشہور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تک

سب کو نااہل قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولیؒ اللہ کو ایک نہیں کئی بار بےخبر لکھا ہے ان کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں آں محترم کو کوئی عقلی بات نہ ملی۔ علامہ اقبال، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ اور سید قطب شہید آں جناب کی نظر میں اس دور کی سب سے بڑی مصیبت ہیں۔ اسی طرح قدیم وجدید سارے دینی لٹریچر خواہ تفسیری ہو یا حدیثی، سیرت سے متعلق ہو یا تاریخ سے سب کا سب نامعتبر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نظریہ اعراض کے خلاف سارے علماء، فقہاء، محدثین اور مفسرین اور ان کی کتابیں ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ قسم کی کتابوں میں بعد کے زمانہ میں پیش آنے والے حالات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کتابیں اپنی تمام خوبیوں کے باوجود موجودہ زمانہ کے اعتبار سے غیر متعلق ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی کم وبیش اس پورے تصنیفی ذخیرہ کا حال ہے جس کو آج اسلامی کتب خانہ کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کسی مستند تفسیر کو پڑھئے۔ آپ پائیں گے کہ اس میں صبر واعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے مثلاً القرطبی کی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے۔ ھو منسوخ بقولہ فاقتلوا المشرکین (۱۰/۶۲) اسی طرح آیت ''وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیت نازل ہونے کے بعد وہ منسوخ ہوگئی ھی منسوخۃ بالقتال۔ (۱۰/۲۰۲)

صبر واعراض اسلام کا اہم ترین حکم ہے۔ قرآن میں کہیں بالواسطہ انداز میں اور کہیں براہ راست طور پر اس کی تاکید کی گئی ہے۔ حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پورا قرآن کتاب صبر ہے مگر جو آدمی تفسیر کی ان کتابوں کو پڑھے اس کا عام تاثر فطری طور پر یہ ہوگا کہ صبر واعراض کی آیتیں اب صرف تلاوت کیلئے ہیں۔ اب اس سے متعلق جو قرآنی حکم ہے وہ صرف جہاد وقتال ہے۔ صبر واعراض کا حکم کمزوری کے دور میں تھا۔ اب مسلمان طاقتور ہیں، اب ہمیں صبر نہیں کرنا ہے بلکہ لڑ کر غیر اسلامی عناصر کو زیر کرنا ہے۔

اسی طرح حدیث کی کتابیں بے شمار قیمتی تعلیمات سے لبریز ہیں مگر اپنی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے وہ غلط فہمی کا باعث بنتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ صحاح ستہ یا حدیث کی اور کوئی مستند کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں آپ کو دعوت وتبلیغ کا باب نہیں ملے گا موجودہ کتب حدیث میں، باعتبار ترتیب، ہر قسم کے ابواب ہیں مگر دعوت وتبلیغ کا باب ان میں سرے سے موجود نہیں۔

جو لوگ ان کتب حدیث کو پڑھتے ہیں وہ قدرتی طور پر تراجم ابواب کے تحت انہیں پڑھتے ہیں۔ اس طرح ان کو پڑھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر قاری کے اندر غیر دعوتی ذہن بنتا ہے جہاد وقتال کے ابواب سے تو وہ خوب آشنا ہو جاتا ہے مگر دعوت وتبلیغ کی اہمیت سے وہ یکسر غافل رہتا ہے۔

اسی طرح سیرت رسول ﷺ پر لکھی جانے والی کتابوں کو دیکھئے۔ سیرت کی تقریباً تمام مستند کتابیں غزواتی پیٹرن پر لکھی گئی ہیں ابن ہشام کی مشہور چار جلدوں کی سیرت کا ایک جلد سے کچھ زیادہ حصہ ۱۳ سالہ مکی دور پر ہے اور بقیہ تقریباً تین جلدیں ۱۰ سالہ مدنی دور پر۔ مدنی دور کے ابواب کی ترتیب سیرت کی تمام کتابوں میں غزوات کی بنیاد پر کی جاتی ہے حتی کہ سیرت کی ابتدائی کتابوں کا نام ہی ''مغازی'' ہوا کرتا تھا اگرچہ بعد کی کتابوں کے نام مغازی پر نہیں رکھے گئے۔ مگر عملاً سیرت کی تقریباً تمام کتابیں مغازی ہی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تاریخ تک پہنچ کر یہ صورت حال اور زیادہ سنگین ہوجاتی ہے کیونکہ تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی کتابیں، تقریباً بلا استثناء جنگ آزمائی اور کشور کشائی کی داستاں نظر آتی ہے یہ سیاسی فتح وشکست اور بادشاہوں کی موت وحیات کا بیان ہو کر رہ گئی ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے پہلی بار اسلامی تاریخ کی اس کمی کا احساس کیا اور وسیع تر انداز میں اسلام کی جامع تاریخ لکھنا چاہا۔ انہوں نے اپنے مقدمہ تاریخ میں کامیابی کے ساتھ اس جدید تاریخ کے اصول مقرر کئے مگر وہ خود بھی اس انداز پر اسلام کی تاریخ مرتب نہ کرسکے۔

بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں (صوفیا کی غیر معتبر کتابوں کو چھوڑ کر) تقریباً سب کی سب اسی نہج پر تھیں۔ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک معرکۃ الآرا کتاب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''اس میں دین ونظام شریعت کا نہایت مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۲۱۵)

''مگر اس کتاب کا حال یہ ہے کہ اس میں مسواک اور سترہ تک کے ابواب ہیں مگر اس میں دعوت وتبلیغ کا سرے سے کوئی باب ہی نہیں۔ اس کے برعکس اس میں جہاد وقتال کو سب سے زیادہ اہم اسلامی عمل بتایا گیا ہے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۵۹ تا ۶۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں اسلاف کے پورے تصنیفی ذخیرہ کو غیر معتبر ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں جہاد وقتال کو سب سے زیادہ اہم اسلامی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ جہاد وقتال کی باتیں آں محترم کے نزدیک تشدد اور تعدی کے ہم معنی ہیں اور ہندوستان میں کفار ومشرکین کے سامنے سرنگوں ہونے اور سپر ڈال دینے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

تعلیم اس کو چاہئے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر

مسائل قدیم ودلائل جدید

''دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ (۱۹۸۳ء-۱۸۹۵ء) جو حکیم الامت کے نام سے مشہور ہیں ان کا ایک طویل مقالہ میں نے پڑھا یہ پورا مقالہ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے موضوع پر تھا مگر اس میں مجھے اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملا۔ مولانا طیب صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا خلاصہ دولفظوں میں ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں۔ تاکہ یہ نئی تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابتِ نبوی ﷺ کا حق ادا کرسکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔''

(فکر اسلامی کی تشکیل جدید، صفحہ:۸۳، صفحہ ۶۲)

اس اقتباس میں برادر محترم کو اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہ ملنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ محترم قاری محمد طیب صاحبؒ نے خلافت الٰہی اور نیابت نبوی ﷺ کو مرکزی نقطہ قرار دیا ہے اگر وہ کہتے کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے لئے اسلام کے تصور جہاد کو اس دور میں ختم کر دینا ضروری ہے تو آپ دیکھتے کہ وہ قاری صاحبؒ کو دور جدید کا صحیح معنی میں حکیم الامت قرار دیتے۔

''مگر مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں'' کا نظریہ فقہ کے بارے میں کلی طور پر درست نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ قرآن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہے۔ جب کہ فقہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں وقتی اور زمانی ہے۔

مثال کے طور پر ہماری مدون فقہ پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کرتی ہے دارالاسلام اور دارالحرب، دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ ہو اور دارالحرب وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ نہ ہو۔ اس فقہ کی روشنی میں، مسلمان دارالحرب کے مقابلہ میں امکانی طور پر برسر جنگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاری طیب صاحبؒ کے مذکورہ اصول کے مطابق اس قدیم فقہی اصول کو جدید دلائل سے آراستہ کر کے دوبارہ مستحکم کیا جانا چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ طرز فکر یقینی طور پر درست نہیں۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ اس فقہی تقسیم پر نظر ثانی کی جائے نہ کہ اس کو از سر نو مدلل کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔

قدیم فقہ اور جدید حالات میں فرق کی بناء پر اس طرح کے بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں مگر جامد تقلید کی بناء پر لوگ نہ تو انہیں سمجھ سکے اور نہ اس کے حل کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۶۲ - ۶۳)

قرآن اور فقہ دونوں کی حیثیت ہر کوئی جانتا ہے فقہ کو قرآن کے برابر کوئی نہیں سمجھتا۔ لیکن فقہ کو کنڈم کرنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کی بنیاد قرآن وسنت ہی ہے۔ فقہ نے پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کیا ہے تو آخر کیوں غلط ہے؟ اس کا جواب آں محترم کے پاس اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ ہماری مدونہ فقہ نے ایسا تقسیم کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں آخر یہ بھی کوئی دلیل ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔ دو چار آیات قرآنی اور احادیث نبوی پیش کر کے بتایا جاتا کہ اللہ اور اس کے رسول نے دنیا کی پانچ تقسیم کی ہے اور فقہ دو ہی تقسیم کر رہی ہے اسی لئے یہ تقسیم غلط ہے۔ تو یہ ایک بات ہو سکتی تھی مگر نہ تو کوئی نقلی دلیل پیش کی گئی اور نہ اصلی۔ پھر یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ اس تاریخ سے دنیا کے تمام ممالک دار الحرب قرار پائیں گے۔

قرآن کی رو سے سارے انسانوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اہل حق یا اہل باطل، اولیاء اللہ یا اولیاء شیطان، مومن یا کافر، تو دنیا کو دو خانوں میں تقسیم کرنے میں آخر کونسی شرعی یا عقلی قباحت ہے؟ آپ کو اس سے کیوں متلی ہو رہی ہے؟ خدا کی زمین پر شیطان کی حکومت قائم کرنے والوں سے آپ کی گاڑھی چھنتی ہے اور ان کے لئے اپنے دل میں بڑی وسعت رکھتے ہیں لیکن خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنے کی بات بڑی کڑوی لگتی ہے۔

گمراہی کی بات

برادرِ محترم نے ایک بڑی گمراہی کی بات کہی ہے:

''اس پسماندگی کا واحد سبب جدید علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن ہے مسلمان جدید علوم میں پیچھے ہو گئے اس لئے وہ جدید صنعت میں بھی پیچھے ہو گئے اور جدید صنعت کے پیچھے ہونے کے نتیجہ میں وہ دور جدید کے ہر شعبہ میں پچھڑ کر رہ گئے کیونکہ موجودہ زمانہ میں تمام چیزوں کا تعلق علم سے ہو گیا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۷۹)

مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب جدید علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن بتایا جاتا تو بڑی حد تک صحیح ہوتی اور کسی کو اس سے انکار نہیں ہوتا۔ لیکن اس کو واحد سبب بتانا یہ بڑی گمراہی کی بات ہے۔ واحد سبب اگر کسی چیز کو کہا جا سکتا ہے تو وہ ہے دین سے دوری، کتاب وسنت سے وابستگی میں کمی، اس کے علاوہ کسی بھی سبب کو واحد سبب نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمان جب عروج اور ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچے تھے تو اس وجہ سے نہیں

کہ وہ اپنے دور کے علوم میں سب سے آگے تھے بلکہ عروج کا واحد سبب دین وایمان میں پختگی تھا۔ اس لئے اس پسماندگی کو ختم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دین سے وابستگی ہے۔

لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا

ترجمہ: یعنی اس امت کے بعد کے لوگ اسی چیز کے ذریعہ درست ہوں گے جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔

اس قول میں مکمل بات بتادی گئی ہے۔

سیکولرزم

برادرِ محترم سیکولرزم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دورِ جدید کے فکری مسائل میں سے ایک وہ ہے جو سیکولرزم کی نسبت سے پیدا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ پالیسی کے لئے سب سے زیادہ مقبول اور مستند نظریہ وہی ہے جس کو عام طور پر سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ کسی اسٹیٹ کا سیکولر ہونا اس کے ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے اور اس کا غیر سیکولر ہونا اس کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی علامت۔

مسلمانوں کا ایک گروہ خاص طور پر اسلام پسند طبقہ سیکولرزم کے سخت خلاف رہا ہے وہ اس کو ایک اسلام دشمن نظریہ کے طور پر دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کو غیر مذہبی اور خالص دنیوی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ اس طرح وہ اسلام کی نفی بن جاتا ہے کیونکہ اسلام کا تقاضہ یہ ہے کہ ریاست کو وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے۔

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام پسند حضرات کی یہ رائے سیکولرزم کے انتہاء پسند نمائندوں کی رائے کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔ مگر یہ ایک ایسی غلطی ہے جسے کچھ غیر مسلم دانشور انتہاء پسند مسلم نوجوانوں کے جنگجو یانہ خیالات کو لیکر اس کی بنیاد پر اسلام کی تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیکولرزم کے بارے میں وہی رائے درست ہے جو انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس میں دی گئی ہے اس کے مطابق سیکولرزم کسی مذہب مخالف نظریہ کا نام نہیں۔ وہ اس بات کا نام ہے کہ اسٹیٹ اپنے آپ کو اس کا پابند بنالے کہ وہ ہر شہری کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت (Non-Interference) کی پالیسی اختیار کرے گی۔ یہ دراصل ایک عملی بندوبست کی بات ہے نہ کہ کوئی مقدس نظریہ، اپنی رو کے اعتبار سے صلح حدیبیہ جیسا ایک عملی حل ہے اور وہ اہل اسلام کے عین حق میں ہے۔

سیکولرزم نے تاریخ میں پہلی بار اہل توحید کو یہ موقع دیا کہ ریاست کی طرف سے تعذیب (Persecution) کا خطرہ مول لئے بغیر اپنے عقائد کی آزادانہ تبلیغ کریں۔ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے تو وہ

''اسلامی حکومت قائم کرو'' کے نعرے سے قائم نہیں ہوتی۔ پاکستان کی مثال اس کا واضح ثبوت ہے۔سیکولرزم کا اصول ہمیں یہ موقع دیتا ہے کہ ہم آزادانہ طور پر ساری دنیا میں اسلام کی پرامن اشاعت کریں۔اس عمل کے نتیجہ میں کسی سماج کی اکثریت میں اگر اسلامی حکومت کی طلب پیدا ہوجائے تو وہاں اسلام کی حکومت بھی قائم ہوسکتی ہے اور اسلام کی حکومت ہمیشہ سماجی طلب کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہے۔ وہ مطالباتی سیاست کے ذریعہ کبھی قائم نہیں ہوتی۔'' (فکر اسلامی،صفحہ:۸۶ تا ۸۷)

غور کیجئے برادر محترم نے سیکولرزم کے بارے میں اسلام پسندوں کی رائے سے اختلاف تو کیا ہے لیکن اختلاف کی وجہ نہ کوئی شرعی بنیاد بتلائی ہے اور نہ کوئی عقلی اصول۔آں محترم کو یہاں یہ بتلانا چاہئے تھا کہ اسلام پسندوں نے جس دلیل کی بنیاد پر سیکولرزم کو اسلام کی نفی قرار دیا ہے وہ بنیاد صحیح نہیں ہے اور اسلام پسندوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ سیکولرزم میں ریاست کی بنیاد غیر مذہبی اور خالص دنیاوی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اور اسلام میں ریاست کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر قائم ہوتی ہے لیکن اسلام پسندوں کی ان دو دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل پر بھی کوئی بحث نہیں فرمائی گئی ہے۔

اسلام پسندوں نے سیکولرزم سے اسلام کی نفی کا نتیجہ دو مقدموں سے نکالا تھا ایک تو یہ کہ سیکولرزم میں ریاست کی بنیاد غیر مذہبی ہوتی ہے اور اسلام میں ریاست کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر ہوتی ہے۔ان دو چیزوں میں سے کسی بھی چیز کی برادر محترم تردید نہیں کرسکے اور نہ کرسکتے تھے اس لئے ایک چٹکلہ چھوڑا اور دامن بچاکر نکل گئے۔یہ کہنا کہ اسلام پسند حضرات کی یہ رائے سیکولرزم کے انتہاء پسند نمائندوں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے، کافی نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ سیکولرزم کے اعتدال پسند نمائندوں کی کیا رائے ہے؟ کیا وہ ریاست کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر رکھنے کی بات کرتے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو اعتدال پسندوں کی رائے بتاکر اسلام پسندوں کے خیال کی تردید باآسانی کی جاسکتی تھی۔مگر اس طرح کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے اس لئے لائیں گے تو کہاں سے لائیں گے؟

اپنے ہندوستان میں پچاس سال سے سیکولر جمہوریت کا دور دورہ ہے لیکن آج تک سیکولرزم کی تعریف نہیں کی جاسکی ہے۔دستوری، قانونی اور عملی کسی اعتبار سے سیکولرزم کی شکل متعین نہیں ہوسکی۔اسی وجہ سے برادر محترم کو سیکولرزم کے مفہوم کو تلاش کرنے کے لئے انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کرنی پڑی۔جس سے معلوم ہوا کہ سیکولرزم مخالف مذہب نہیں ہے۔لیکن پھر بھی یہ بات تشنہ رہی کہ سیکولرزم اپنے نظام میں مذہب کو دخل دینے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔عام طور پر سیکولر پسند لوگ اس سوال کو نظر انداز کردیتے ہیں اس لئے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ سیکولرزم مخالف مذہب نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ سیکولرزم پرائیوٹ اور نجی زندگی میں مخالف نہیں ہے اور جہاں تک سوال اجتماعی زندگی یعنی حکومت اور سیاست کا دائرہ ہے اس دائرے میں سیکولرزم اسلام کیا کسی بھی

مذہب کو جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔اس لئے اسلام پسندوں کا کہنا ہے کہ اس بات کو وہ لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جن کے یہاں مذہب کا تعلق صرف پرائیوٹ زندگی سے ہے۔جن کے یہاں پوجا پاٹ کی محض چند مراسم کا نام مذہب ہے۔لیکن مسلمانوں کا مذہب پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ پوری طرح اسلام میں داخل ہو جاؤ اور اللہ کے رنگ میں مکمل رنگ جاؤ۔ جہاں دین کے بعض حصے کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا پورے دین کو نہ ماننے کے برابر قرار دیا ہے شریعت اسلامی کے قانون سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کو ایمان کے منافی ہونے کی صراحت موجود ہے کوئی قانون اور ضابطہ کتاب وسنت کی ہدایات کو نظر انداز کر کے بنانا ایمان کے خلاف ہے۔حکم دینے اور کسی بات سے روکنے کا حق صرف خدا اور رسول کو جو دیتا ہے ایسے مذہب کا ماننے والا شخص کیسے یہ تسلیم کرے گا کہ سیکولرزم مذہب مخالف نہیں ہے جب کہ سیکولرزم اجتماعی معاملات حکومت اور سیاست کے دائرے میں کسی مذہبی دخل اندازی کے لئے قطعاً روادار نہیں ہے مذہب کے نام پر کسی شخص کا سیکولر نظام کی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں داخل ہونا تو دور کی بات ہے وہ بحیثیت امیدوار الیکشن میں کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔

''اسٹیٹ اپنے کو اس کا پابند بنالے کہ وہ شہریوں کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گا۔''

یہ سیکولر نظام کی ایک پالیسی ہے سیکولرزم کی یہ تعریف نہیں ہے۔اس پالیسی کی وجہ سے سیکولرزم کو مخالف اسلام نہ سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہندومت اور جین مت کو اس بناء پر مخالف اسلام نہ سمجھنا کہ ان دونوں مذہبوں میں جانداروں پر مہربانی کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ان مذہبوں کی تعریف نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مذاہب کی یہی ایک اچھائی ہے۔کچھ اچھائیاں ہر مذہب اور ہر نظریہ میں ہوتی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن ان مذاہب کی بنیادی بات وہ عقائد ہیں جو خدا کی ذات وصفات اور انسان اور خدا کے درمیان اور پھر انسان انسان کے درمیان تعلقات کی بنیاد بنتے ہیں اسی طرح سیکولرزم کیا ہے یہ جاننے کے لئے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس نظریہ میں خدا کی ذات وصفات کے بارے میں کیا عقائد ہیں حاکمیت اور قانون سازی کا حق اس نظریہ میں کس کو دیا گیا ہے پھر اس نظریہ میں کس شخصیت کو نمونہ عمل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اخلاق، قانون، معیشت، معاشرت اور سیاست کے اصول کہاں سے لئے گئے ہیں اس زاویہ نظر سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سیکولرزم سراسر اسلام کے خلاف ہے جہاں تک سیکولرزم میں کچھ فائدے کا مسئلہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔جیسا کہ کوئی یہ نہیں کہتا کہ شراب میں کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن جس طرح کچھ فائدے کی وجہ سے شراب حلال نہیں ہوجاتی اسی طرح کچھ فائدے کی بناء پر سیکولرزم قابل قبول نہیں ہوگا۔

اسلام

① اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑی حقیقت توحید ہے۔ خدا کا وجود، اس کا وحدہ لاشریک ہونا اور اس کی حاکمیت اور ربوبیت کو تسلیم کرنا ہے اسلام کا پورا نظام خدا کی بندگی سے عبارت ہے اور اس کی حاکمیت سے تابع ہے۔

سیکولرزم

① سیکولرزم وجود باری تعالیٰ اور اس کی صفات کے باب میں یا تو بالکل خاموش ہے یا بحث کرتا ہے تو سینکڑوں خداؤں کے لئے اس کے اندر گنجائش ہے لیکن اپنے نظام میں ایک خدا کا بھی عمل دخل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اسلام

② اسلام مادہ پرستانہ اور ملحدانہ تصور سے بغاوت پر مبنی ہے وہ ساری انسانیت کو انبیاء کرام کے بتائے ہوئے طریقہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

سیکولرزم

② سیکولرزم مادہ پرستانہ تہذیب کی پیداوار ہے جس قافلہ کے رہنما انبیاء علیہم السلام ہیں اس سے اسے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسلام

③ اسلام کی نگاہ میں زندگی گزارنے کا صحیح راستہ خالق کائنات نے طے کردیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اس کی نشاندہی کردی ہے۔ اس کے نزدیک خیر و شر اور حسن و قبح کا معیار اور کسوٹی اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے۔

سیکولرزم

③ سیکولرزم کی نگاہ میں صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز اور شر اور خیر کا معیار اور کسوٹی عامۃ الناس کی اکثریت کی خواہشات اور خدا بیزار لیڈروں کے بنائے ہوئے قوانین اور اصول ہیں۔

اسلام

④ اسلام نے انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے اپنے اصولوں کے مطابق لوگوں کی آزاد مرضی کے ذریعہ تمام انسانی حقوق پر مبنی ریاست قائم کرکے دکھا دیا ہے۔

سیکولرزم

④ سیکولرزم کی عملی دنیا میں تمام انسانی حقوق کی حفاظت کے باب میں کوئی تاریخ نہیں ہے وہ محض ایک خیالی دنیا کی بات ہے۔ جس کا کہیں کوئی تجربہ نہیں کیا گیا۔

اسلام اور سیکولرزم میں اس کھلے ہوئے تضاد کے باوجود خدا جانے کس دلیل کے پیش نظر بعض لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ ہندوستان کے تناظر میں موزوں ترین نظام سیکولرزم ہے۔ جس کے معنیٰ ہوتے ہیں کہ اسلام ناقص ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

جہاد

''ایک مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق جہاد سے ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ ساری دنیا سے لڑ کر انہیں مجبور کریں کہ وہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا اسلامی قانون کے ماتحت ہو کر ذمی کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔ اسلامی جہاد کا یہ تصور دور جدید کے اس متفقہ بین الاقوامی تصور سے ٹکراتا ہے کہ ہر ملک پر لازم ہے کہ وہ دوسرے ملک کی سرحدوں کا احترام کرے اور کوئی قوم کسی دوسری قوم کے معاملہ میں مداخلت نہ کرے۔

مگر جہاد کے اس تصور کا قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ یا تو بعض انتہاء پسند مسلم نظریہ سازوں کی اختراع ہے یا غیر مسلم دانشوروں کا اپنا گھڑا ہوا ہے۔

قرآن کے مطابق جہاد (بمعنی قتال) کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک استیصال فتنہ کے لئے (وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ) اور دوسری دفاع کے لئے (وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ).

فتنہ سے مراد اردو معنی میں ''فتنہ فساد'' نہیں ہے اس سے مراد مذہبی تعذیب (Religious Persecution) ہے قدیم زمانے میں عرب میں اور ساری دنیا میں یہ فتنہ موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ اور اصحاب رسول کو حکم دیا کہ اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس مصنوعی رکاوٹ کا خاتمہ کردو۔ چنانچہ انہوں نے اس کا مقابلہ کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔ اب اس فتنہ کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ اس لئے اب اس نوعیت کے جہاد کی ضرورت بھی نہیں۔

دفاع کے لئے جہاد کا حکم اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ تاہم دفاعی جہاد شروع کرنے کیلئے بہت سی لازمی شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دفاع کے نام پر بطور خود کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دے۔

ان دوصورتوں کے سواء کوئی بھی تیسری صورت نہیں ہے۔ جس کے لئے اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کسی کے لئے جائز ہو۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۸۷ تا ۸۸)

مذکورہ بالا پورے اقتباس پر غور کرنے سے برادر محترم کا ایک دعویٰ یہ سامنے آتا ہے کہ جہاد کے اس تصور کا قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی جہاد کا یہ تصور دورجدید کے متفقہ بین الاقوامی تصور سے ٹکراتا ہے۔ یہاں اس بات کے سلسلہ میں ہمارے خیال میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ اس ٹکراؤ والی بات کو کوئی شرعی دلیل کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دورجدید کے سارے نظریات کی بنیاد مادہ پرستی ہے اس لئے تصور جہاد ہی کیا پورا اسلام دورجدید کے افکار سے متصادم ہے۔ دوسری بات جناب نے یہ فرمائی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کی صرف دو قسمیں ہیں ایک استیصال فتنہ کے لئے اور دوسرے دفاع کے لئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ اب فتنہ کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے اس لئے اب اس نوعیت کے جہاد کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن اس بات میں بھی دلیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت قابل قبول ہوسکتی ہے جبکہ یہ ثابت کردیا جائے کہ فتنہ سے مراد مذہبی تعذیب ہے اور اس دور میں مذہبی تعذیب کا کہیں وجود نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہم پورے چیلنج کے ساتھ کہیں گے کہ فتنہ کے وہ معنی نہیں ہیں جو برادر محترم بتاتے ہیں فتنہ سے مراد شرک ہے۔ اس بات کی تصدیق کتب تفاسیر سے کی جاسکتی ہے۔

پھر یہ سوچئے کہ فتح مکہ کے بعد جبکہ مذہبی تعذیب کا خاتمہ ہوگیا تھا اس کے بعد اسلامی فوجوں نے جہاد کا سلسلہ جاری رکھا نہ صرف عرب کے دور دراز علاقوں میں بلکہ ایران، روم اور فارس کی سرحدوں میں گھس کر قتال کیا آخر یہ کس نوعیت کا جہاد تھا اور اس کی کیا وجہ تھی؟ خلافت راشدہ کے دور کی مثالیں تو ضرور بالضرور قرآن کی تفسیر اور دلیل شرعی کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ کے اس ارشاد پر غور کیجئے کہ ''الجهاد ماض الى يوم القيامة،، یعنی جہاد قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ اس حدیث میں کسی خاص نوعیت کے جہاد کے جاری رہنے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں نوعیت کا جہاد اب باقی نہیں ہے تو اسے اس مسئلہ خاص کے لئے کوئی دلیل دینی ہوگی۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت تک جہاد کی علت موجود رہے گی اس لئے جہاد بھی جاری رہے گا۔

دوسری نہایت غلط بات موصوف کا یہ فرمانا ہے کہ دفاعی جہاد شروع کرنے کے لئے بہت سی لازمی شرطیں ہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دن ہونے کے لئے غروب شمس ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہم عرض کریں گے کہ دفاعی جہاد کے لئے ملک اور مقام کی، زمانہ اور وقت کی، کثرت اور قلت کی، خوشحالی اور تنگی کی کوئی شرط نہیں ہے ہر شخص پر فرض ہوتا ہے کہ وہ دفاعی جہاد میں شریک ہو اور اپنا حق ادا کرے حتیٰ کہ عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اس کے لئے بھی نکلنا واجب ہوگا ضرورت پر۔ یعنی عورت کو شوہر سے اجازت لینے کی ضرورت

نہیں، بیٹے کو باپ کی، غلام کو آقا کی اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دفاعی جہاد فرض عین ہوتا ہے۔ (بحوالہ تفسیر القرطبی)

جہاد کا مفہوم اور اس کی غرض و غایت پورے طور پر سمجھنے کے لئے ہم محض ایک آیت، ایک حدیث اور چند علماء کی بات یہاں پیش کرتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں لڑائی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ کفار و مشرکین کی خودمختاری اور بالادستی ختم ہوجائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین پر نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات دین حق کے ماننے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں اور کفار و مشرکین ان کے ماتحت تابع اور مطیع بن کر رہیں۔ اس آیت سے قتال کی وجہ مذہبی تعذیب نہیں معلوم ہوتی بلکہ قتال کی وجہ اور علت دین حق کو نہ ماننا اور مشرکین کی بالادستی ہے۔

مسند امام احمد کی ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

قال وما الجهاد قال ان تقاتل الكفار إذا لقيتم

یعنی پوچھنے والے نے پوچھا کہ جہاد کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم کفار سے لڑو جب کہ تمہاری ان سے مڈبھیڑ ہوجائے۔

بخاری شریف کے شارح ابن حجرؒ نے جہاد کی تعریف میں کہا ہے کہ:

وبذل الجهد في قتال الكفار.

یعنی جہاد نام ہے کفار سے جنگ میں کوشش کو خرچ کرنے کا۔

بخاری کے ایک دوسرے شارح کے الفاظ ہیں:

قتال الكفار لنصرة الاسلام واعلاء كلمة الله.

یعنی اسلام کی مدد اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے کفار سے جنگ کرنا جہاد ہے۔

صاحب درمختار نے لکھا ہے:

الدعاء الی الدین الحق و قتال من لم یقبله.

یعنی دین حق کی طرف بلانا اور جو اس کو قبول نہ کریں اس سے جنگ کرنا یہ جہاد ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے لکھا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کفار سے جہاد بالسیف کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت، حدیث اور علماء کی باتوں سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ جہاد کے مفہوم میں اگرچہ کئی باتیں شامل ہیں لیکن جب جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے جہاد بالسیف ہی مراد ہوتا ہے پھر اوپر کی گفتگو سے یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھی جاسکتی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کو برادر محترم نے ختم کرنے یا محدود کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ یا تو ناواقفیت کی بناء پر ہے یا پھر اس کا محرک کوئی ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنی زبان پر بھی نہیں لا سکتے۔

بینک کا سود

''اس معاملہ میں کوئی حتمی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو علماء کی شوریٰ میں اجتماعی فیصلہ سے طئے کیا جانا چاہئے۔ تاہم میں یہ کہنے کی جرأت کرونگا کہ کچھ لوگوں کی یہ تجویز قابل غور ہے کہ بینک کا انٹرسٹ کمرشیل انٹرسٹ ہوتا ہے اور ہم کو کمرشیل انٹرسٹ اور حاجاتی سود (Usury) میں فرق کرنا چاہئے۔

حاجاتی سود ایک طرفہ نفع اندوزی پر مبنی ہے اور اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن کمرشیل انٹرسٹ نفع میں شرکت (Profit Sharing) کے اصول پر مبنی ہے اس اعتبار سے وہ ایک حق تک مضاربت کے اسلامی اصول سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مضاربت میں نفع اور نقصان دونوں میں شرکت ہوتی ہے اور بینک میں صرف نفع میں شرکت۔

لیکن مضاربت اگر کامیاب اصول ہے تو وہ اس لئے کامیاب اصول ہے کہ اس میں زیادہ امکان نفع کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر نقصان کا اندیشہ بڑھ جائے تو مضاربت کا اصول عملاً معطل ہوجائے گا۔ اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو مضاربت اور کمرشیل بینکنگ کا فرق زیادہ تر جزئی اور اضافی بن جاتا ہے نہ کہ کلی اور حقیقی۔''

(فکر اسلامی: صفحہ ۸۹)

بینک انٹرسٹ کے بارے میں آپ کے نزدیک علماء کی شوریٰ میں اجتماعی فیصلہ کرنا چاہئے اور آپ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے تو آپ اس کو آدھا جائز بتانے کی جرأت کیوں کر رہے ہیں؟

اسلامی مشن کیا ہے؟

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کی ذمہ داری یا اسلامی مشن کا نشانہ لوگوں کے اوپر اسلامی سسٹم کا عملی نفاذ نہیں ہے بلکہ پرامن حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کو اسلام سے باخبر کرنا ہے داعی اسلام کی ذمہ داری صرف اسلام پہنچانا ہے اس کے بعد اب مدعو کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو مانے یا اس کا انکار کردے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ:۱۴۱)

اس عبارت کی روشنی میں ہجرت اور جہاد، ایثار وقربانی کے متعلق ساری تعلیمات بلا وجہ کتاب وسنت اور تاریخ اسلام میں نظر آتی ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کا کوئی محل نہیں ہوگا کہ آپ نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا الا الہ الا اللّٰہ

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لوگ لا الہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیں۔

چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو لوگ بھی ایمان نہیں لائے انہیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا گیا یا انہیں قتل کردیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہوش وحواس رکھنے والا آدمی اس امر واقعہ کا انکار نہیں کرسکتا۔ جزیرۃ العرب کے باہر دنیا کو اتنی چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ اسلام کا کلمہ نہیں پڑھتے تو نہ پڑھیں لیکن انہیں اسلام کا تابع بن کر رہنا ہوگا۔ نہیں معلوم اتنی بڑی بڑی حقیقتوں کا انکار کرنے کی برادر محترم کو کیسے جرأت ہوتی ہے؟

آسان اور مشکل چیز

''یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ رسولؐ کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب کرتے تھے۔'' (بخاری)

برادر محترم نے حدیث کا آخری حصہ چھوڑ دیا ہے پوری حدیث یوں ہے:

نبی کو دو امر کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر ان میں سے آپ نے آسان ترین کو اختیار فرمایا جب کہ وہ گناہ نہ ہو، اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ اس سے بہت زیادہ دور ہوتے اور آپ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی معاملہ میں انتقام نہیں لیا إلاَّ یہ کہ اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی کسی چیز کی حرمت پامال کی جاتی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے لئے انتقام لیتے۔

اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے امام مسلمؒ نے جو باب باندھا ہے اس میں صراحت کردی ہے کہ یہاں انتخاب کی بات دو مباح چیزوں کے درمیان کے متعلق ہے۔ برادر محترم نے جس انداز میں اس حدیث کو پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر ایک بچہ کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب قریش مکہ نے کئی آسان چیزوں کی پیش کش

کی تو اللہ کے رسول ﷺ ان سب کو ٹھکرا کر ان سے کشمکش کے لئے کیوں بضد ہو گئے۔

اسلام کا سیاسی نظام

''جہاں تک خلافت یا اسلام کے سیاسی نظام کا سوال ہے، وہ ایک مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ اس کے قیام کے لئے تشدد یا جنگ کا طریقہ اختیار کرنا کسی بھی طرح اسلام میں جائز نہیں کیوں کہ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو موجودہ (Existing) نظام سے عملی ٹکراؤ پیش آجائے گا اور قائم شدہ نظام ایسی تحریک کو دبانے کے لئے طاقت کا استعمال کرے گا۔ اس طرح جو چیز پہلے چھوٹا شر (Lesser Evil) کے درجہ میں تھی وہ زیادہ بڑا شر (Greater Evil) کی سطح تک پہنچ جائے گی۔ مزید یہ کہ عملی ٹکراؤ پیش آنے کے نتیجہ میں پر امن دائرہ میں کام کرنے کے مواقع بھی برباد ہو جائیں گے۔ ایسا ہر اقدام قرآن کے الفاظ میں فَسَادٌ فِي الْأَرْضِ (۲:۵۲) قرار پائے گا۔ وہ ایک جرم ہوگا نا کہ کوئی اسلامی عمل۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۴۲)

یہاں اسلام کے سیاسی نظام یا خلافت قائم کرنے کو مشروط حکم بتانے کی وجہ یہ بتائی جا رہی ہے کہ دوسری صورت میں برسر اقتدار نظام کو عملی ٹکراؤ کی ضرورت پیش آئے گی اور اس عملی ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو صورت حال پیش آئے گی وہ فساد فی الارض کی تعریف میں آئے گی یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فساد فی الارض کی تعریف کیا اللہ کے رسول ﷺ، آپ کے صحابہؓ اور انبیاءؑ سابقین کو معلوم نہیں تھی؟ کہ یہ اللہ کے بندے جہاں بھی رہے اور گئے وقت کے نمرود، فرعون، ابوجہل، ابولہب سے ٹکراتے رہے۔

جنگ میں پہل

''قرآن کے مطابق دوسروں کے خلاف جنگ کا آغاز کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں (۹:۱۳) اسلام میں جنگ صرف دفاع کیلئے ہے نہ کہ جارحیت کیلئے (۲:۱۹۰) مزید یہ کہ اگر کوئی گروہ جنگ چھیڑنا چاہے تب بھی آخری حد تک اعراض کی کوشش کی جائے گی اسلام میں دفاعی جنگ بھی اسی وقت ہے جب کہ فریق ثانی نے عملی جارحیت کر کے کوئی انتخاب (Option) ہمارے لئے باقی نہ رکھا ہو'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۴۲ تا ۱۴۳)

اس موقع پر ہم برادر محترم سے تین باتیں عرض کریں گے۔ سورہ توبہ کی صرف اس آیت پر غور کیجئے،

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: ان لوگوں سے لڑو، جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام

کردہ شئے کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

اس آیت میں قتال کا جو حکم دیا گیا ہے۔ وہ دفاع کے لئے ہے یا اقدام کے لئے؟ دوسری بات یہ ہے کہ روم وفارس سے جو ٹکراؤ ہوا تھا وہ ان ملکوں کی جارحیت کی بناء پر ہوا تھا یا بالقصد اظہار دین اور غلبۂ دین کے لئے ہوا تھا؟ تیسری بات ہم صاحب ہدایہ کے ایک جملہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائیں گے وہ لکھتے ہیں:

"قتال الکفار واجب وان لم یبدؤنا"

یعنی کفار سے جنگ واجب ہے اس عبارت میں یہ بتانا ہر گز مقصود نہیں ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ میں پہل بھی کی جاسکتی ہے اگر ایسی بات ہوتی تو ''واجب'' کے بجائے ''جائز'' کا لفظ استعمال ہوتا لفظ ''واجب'' پہل اور اقدام کو جائز ہی نہیں واجب بتاتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے۔

"قتال الکفار الذین لم یسلموا وھم من مشرکي العرب اولم یسلموا ولم یعطوا الجزیة من غیر ھم واجب وان لم یبدونا"

یعنی ان کفار سے جو ایمان نہ لائیں اور وہ مشرکین عرب میں سے ہوں یا غیر عرب میں سے جو ایمان نہ لائیں اور جزیہ نہ دیں جنگ واجب ہے اگرچہ کہ وہ پہل نہ کریں۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ قتال کو واجب بتایا گیا ہے اور صلح محض جائز ہے اور اس کا جواز بھی مشروط ہے۔

مسلم ملک یا غیر مسلم ملک

''مسلمان خواہ کسی مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں، دونوں حالتوں میں انہیں ملک کے دستور اور قانون کا پابند رہنا چاہئے۔ دستور اور قانون کی خلاف ورزی کرنا یا اسلام کے نام پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونا کسی بھی حال میں مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ قانون کی حد ہی ہمارے عمل کی حد بھی ہے۔ جہاں قانونی اجازت کی حد آجائے، اس کے بعد ہمارے لئے صبر ہے نہ کہ ٹکراؤ اور قانون شکنی۔

جو مسلمان غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہیں یعنی ان ملکوں میں جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے اور وہاں ان کی مرضی کا سیاسی نظام قائم ہے وہاں مسلمان کی حیثیت معاہد کی ہے خواہ دونوں کے درمیان لفظی معاہدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ وہاں بسنے والے مسلمانوں کے لئے ملکی قوانین وضوابط کی پابندی لازمی طور پر ضروری ہے۔ کسی بھی عذر کی بناء پر اس کی خلاف ورزی ان مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

ان غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ اپنا ایک دستور اور قانونی نظام ہے۔ یہ دستور اور قانون کسی چیز کو جائز (Law Ful) اور کسی چیز کو ناجائز (Un Law Ful) قرار دیتا ہے۔ جب بھی کوئی مسلمان کسی ایسے ملک میں داخل

ہوتا ہے تو اپنے آپ ہی وہ ملک کے قانونی نظام کے تحت آجاتا ہے۔ ایسے مسلمان اور ایسے ملک کے درمیان اپنے آپ ایک خاموش معاہدہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہ مذکورہ مسلمان اس ملکی نظام کا مکمل طور پر لفظی اور معنوی پابند رہے گا۔ کسی بھی حال میں وہ اس کی کھلی یا چھپی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

ایسی حالت میں کسی غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کیلئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ مذکورہ ملک کے قانون کی مکمل پابندی کر کے وہاں رہے یا اگر اس کو اس سے اختلاف ہے تو خاموشی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر وہاں سے باہر چلا جائے۔ تیسرا انتخاب (Option) یعنی ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں مقیم رہنا۔ یقینی طور پر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ ایسا عمل سراسر ناجائز ہے۔ جو لوگ اس قسم کا تیسرا انتخاب اختیار کریں وہ اسلامی اصول کے مطابق مجرم ہیں اور وہ بلاشبہ خدا کے یہاں سزاء کے مستحق قرار پائیں گے۔ ملکی نظام کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں اگر نظام سے ٹکراؤ پیش آئے تو وہ دفاع کا مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک مجرمانہ فعل ہوگا۔ ایسے موقع پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان ایک طرفہ واپسی کے ذریعہ ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیں نہ کہ اس کو دفاع قرار دے کر نظام کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامک ایکٹوزم صرف وہی ہے جو دعوت کی راہ سے اور دعوت کے اسلوب میں چلائی جائے۔ دعوت کے اسلوب میں کی جانے والی جدوجہد کو اس دنیا میں اللہ کی نصرت ملتی ہے۔ اسلئے صرف وہی دنیا میں کامیاب ہوتی ہے۔ دوسرے اسلوب کی کوئی جدوجہد خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ خواہ اس کا نام اسلامی اور قرآنی جدوجہد ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا ہو۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۴۳ تا ۱۴۴)

اس پورے لمبے اقتباس میں کئی مسائل قابل غور ہیں

① مسلم اور غیر مسلم ملک: یعنی مسلمان حاکم اور غیر مسلمان حاکم۔ دونوں کو اطاعت کے معاملہ میں برابر نہیں رکھا جاسکتا قرآن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں پر ''مِنكُمْ'' (یعنی تم میں سے) کا لفظ بھی آیا ہے۔ جس سے اس بات کی صراحت ہوجاتی ہے کہ جس ''أُولِي الْأَمْرِ'' یعنی صاحب اقتدار و اختیار کی اطاعت کا حکم دیا جا رہا ہے وہ مسلمان ہو نہ کہ کافر مشرک۔ اسی کے ساتھ صراحت کے ساتھ کافر و مشرک کی اطاعت سے متعدد جگہ قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ اسلئے کافر و مشرک حکمراں کی اطاعت کی بات کرنی شرعی لحاظ سے بالکل نادرست ہے۔

② جو مسلمان غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہیں ہم نے یہ مانا کہ ان کی حیثیت معاہد کی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ معاہدہ کتنی مدت کے لئے ہے شرعی اعتبار سے کیا کوئی معاہدہ بلا میعاد بھی ہوسکتا ہے؟ اور پھر کیا وہ معاہدہ

ٹوٹ نہیں سکتا۔؟ اگر فریق ثانی اس معاہدہ کا لحاظ وخیال نہ کرے اور بار بار معاہدہ کی خلاف ورزی کرے دورنبویؐ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہودیوں سے کیا ہوا معاہدہ صرف اس وجہ سے کالعدم قرار پایا کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان عورت کے ساتھ ناشائستہ حرکت کی تھی۔

(۳) یہ آپ نے صحیح فرمایا کہ کسی غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے ایک تو وہ یہ کہ مذکورہ ملک کے قانون کی مکمل پابندی کرے یا اگر اس کو اس سے اختلاف ہے تو خاموشی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر وہاں سے باہر چلا جائے۔

تیسری صورت اختیار کرنے والا اسلامی اصول کے مطابق مجرم ہے یہ بات جس شکل میں برادر محترم نے پیش کی ہے وہ جزوی حیثیت سے صحیح ہوسکتی ہے لیکن اگر صورت حال یہ ہو ہمارے ملک پر کوئی غیر مسلم خواہ وہ انگریز ہوں یا اور کوئی، زبردستی قابض ہو گئے ہیں اور بزور ہم پر اپنا حکم چلا رہے ہوں تو کیا اس صورت میں بھی ایک مسلمان کیلئے صرف دو ہی راہیں ہیں؟ آخر جبر وظلم کے خلاف اس کیلئے اٹھنا کیوں صحیح نہیں ہوگا؟ اور وہ کیوں مجرم ہوگا اور وہ کیوں خدا کے یہاں سزا کا مستحق قرار پائے گا؟

(۴) ملکی نظام کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں نہیں بلکہ ملکی نظام اپنے معاہدہ یعنی اپنے دستور کی خلاف ورزی کرے اور اس صورت میں ٹکراؤ پیش آئے تو وہ دفاع کا مسئلہ کیوں نہیں ہوگا؟ وہ ایک مجرمانہ فعل کیوں ہوگا اور کس بنیاد پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے موقع پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان ایک طرفہ واپسی کے ذریعہ ٹکراؤ کی حالت کو ختم کردیں اور دفاع نہ کریں۔

(۵) اللہ کی نصرت ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت آئی جب کہ دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ میدان بدر میں تین سَو تیرہ مسلمان اپنا سب کچھ لے کر آ گئے اور باطل کے خلاف اپنی آخری جان ومال کی پونجی قربان کردینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ دعوت، ہجرت اور جہاد کو ایک دوسرے سے مربوط رکھ کر آپ سوچیں تو صحیح نتیجہ تک پہنچیں گے ورنہ گمراہیوں کے لق ودق صحرا میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔

آپریشن رحمت کے خلاف نہیں ہے

> ''اسلام بنیادی طور پر ایک امن پسند مذہب ہے اسی لئے پیغمبر اسلام کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے یعنی سارے عالم کے لئے رحمت ۔گویا پیغمبر اسلام پیغمبر رحمت ہیں نہ کہ پیغمبر حرب۔ آپ ﷺ کا طریقہ (Non-Violence) ہے نہ کہ تشدد۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۱۵۲)

اس میں کیا شک ہے کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے جس طرح ایک ڈاکٹر صحت پسند ہونے کے باوجود

صحت ہی کے لئے نشتر چلانے پر مجبور ہو جاتا ہے اسی طرح ایک امن پسند مذہب امن کے لئے ہی حرب وضرب کا راستہ اختیار کرتا ہے جس طرح صحت کے لئے نشتر اور آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح امن کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسلام نے تلوار اٹھانے کو ضروری قرار دیا ہے کہ اگر نشتر چلانے والے ڈاکٹر کو بے رحم اور تشدد اختیار کرنے والا نہیں کہہ سکتے تو اسی طرح تلوار اٹھانے کی بات کرنے والے مذہب کو تشدد اور حرب کا مذہب نہیں کہہ سکتے وہ بہر صورت امن پسند مذہب ہی ہوگا۔

کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کی وہی ترتیب ہے جو یمن جاتے ہوئے حضرت معاذؓ نے بتائی تھی اور جو اصول فقہ میں بھی بتائی گئی ہے کہ قرآن پھر سنت پھر اجماع اور پھر قیاس۔ یعنی قیاس کا اصول اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ قرآن اور سنت و اجماع میں حکم نہیں ملتا۔

قرآن وسنت اور اجماع کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں کیا جاتا ہے اور بالکل سیدھی سی بات ہے کہ جب ایک حکم خدا اور رسول ﷺ سے ہمیں مل گیا تو پھر اپنی عقل لگانے کی کیا ضرورت، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص اپنی عقل اور قیاس لگاتا ہے تو یہ بڑی گمراہی اور ضلالت کا کام ہوگا۔

فقہاء نے شراب اور نبیذ کی قدر مشترک علت کی بناء نبیذ کو حرام اس لئے قرار دیا کہ نبیذ کا حکم کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں تھا اگر نبیذ کا حکم کتاب وسنت میں موجود ہوتا تو قیاس کی ضرورت کیوں پڑتی؟

جس طرح مسلم حکمراں کی اطاعت یا اس سے بغاوت کے سلسلہ میں واضح اور صریح حکم موجود ہے اسی طرح غیر مسلم حکمراں کے بارے میں بھی قرآن میں صریح ہدایات موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے قیاس کرنے کی کوشش کرنا شریعت کے صریح احکام کو ٹھکرا دینے کے برابر ہے۔ قرآن میں جہاں پر اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں پر "مِنْكُمْ" کی قید بھی لگائی گئی ہے یعنی وہ تم میں سے ہو، مسلمان ہو۔

پھر آیت کے آخری ٹکڑے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حاکم کی اطاعت بھی اسی وقت تک کی جائے گی جب تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشاء کے خلاف حکم نہیں دیتا اسی کو کہتے ہیں اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ کسی کی بھی اطاعت کی جائے گی تو وہ معروف میں کی جائے گی منکر میں نہیں۔ اس کے ساتھ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکمراں کا فسق برداشت کیا جائے گا اس کے خلاف بغاوت منع ہے اِلّا یہ کہ وہ صریح کفر کا ارتکاب کرے۔ یہاں سے یہ بات خود معلوم ہو جاتی ہے کہ کفر بواح کی صورت میں مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت جائز ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی حکمراں سرے سے مسلم ہے ہی نہیں تو اس کی اطاعت کا کیا سوال؟ اور اس کے خلاف جانا کیوں منع ہوگا؟

غیر مسلم حکمراں کا معاملہ

خان صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک مسلم حکمراں کا معاملہ ہے، اس کے خلاف خروج کی حرمت صریح احادیث سے ثابت ہے۔ اسی لئے تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکمراں اگر غیر مسلم ہو تو اس کے بارے میں شریعت اسلامی کا حکم کیا ہے۔

یہاں شریعت کا اصول قیاس ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اصول فقہ میں یہ بات مسلم ہے کہ شرعی احکام کے ماخذ چار ہیں ......قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ زیر بحث معاملہ میں قیاس کے اصول میں ہمارے لئے واضح رہنمائی موجود ہے۔

فقہ کی تمام اہم کتابوں میں قیاس پر بحث کی گئی ہے۔ شرعی قیاس کیا ہے، اس کو اصول فقہ کی کسی بھی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فنی اصطلاحات سے قطع نظر، سادہ طور پر قیاس کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ اشتراک علت کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں دوسری چیز کے مماثل حکم ثابت کرنے کا نام ہے اثبات مثل حکم معلوم فی معلوم اٰخر لاشتراکھما فی علۃ الحکم۔ (ناصر الدین البیضاوی، منہاج وصول: ۲/۳)

بیضاوی کے مذکورہ الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے دکتور صلاح الدین زیدان نے لکھا ہے کہ جب حکم کی علت میں مماثلت پائی جائے تو نتیجتاً حکم میں بھی مماثلت ہوگی (التماثل فی علۃ الحکم یؤدی الی التماثل فی الحکم، الدکتور صلاح الدین زیدان، حجیۃ القیاس، صفحہ ۲۳)

مثال کے طور پر شراب کے بارے میں یہ حکم ثابت ہے کہ وہ حرام ہے لیکن کھجور سے تیار کی گئی نبیذ کا حکم صراحتاً قرآن یا حدیث میں موجود نہیں۔ مگر فقہاء نے اس کو حرام قرار دیا ہے کیوں کہ نبیذ اور شراب میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے دونوں کا مسکر یعنی نشہ آور ہونا۔ اب چونکہ اس قدر مشترک کی بناء پر شریعت نے شراب کو حرام ٹھہرایا ہے لہٰذا نبیذ اور کھانے پینے کی وہ ساری چیزیں جو مسکر (نشہ آور) ہیں ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو شراب کا حکم ہے۔

اس اصول قیاس کو سامنے رکھ کر مذکورہ معاملہ پر غور کیجئے تو جو بات سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ......پیغمبر اسلام نے صراحت کے ساتھ غیر عادل مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) سے منع فرمایا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کا اقدام زیادہ بڑا نقصان، بدامنی اور جان و مال کی تباہی پیدا کرے گا۔

معلوم ہوا کہ اس ممانعت کی اصل علت شدید تر برائی کا پیدا ہونا ہے۔ یہ شدید تر برائی اس وقت بھی پوری طرح ظہور میں آئے گی جب کہ حکمراں غیر مسلم ہو۔ گویا دونوں جگہ علت کا اشتراک پایا جا رہا ہے اور جب علت مشترک ہے تو شرعی اصول کے مطابق حکم بھی مشترک ہوگا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت میں جس طرح غیر عادل مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت ناجائز ہے اسی طرح غیر مسلم حکمراں کے خلاف بھی بغاوت ناجائز ہے خواہ وہ لوگوں کو غیر عادل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خاص مسئلہ میں مسلم حکمراں اور غیر مسلم حکمراں کا فرق محض اضافی ہے۔ کیونکہ حکمراں کے خلاف خروج کی ممانعت اس لئے نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہ ممانعت صرف اس لئے ہے کہ اس قسم کا فعل زیادہ بڑا شر پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ ایسا اقدام عملی طور پر الٹے نتیجہ والا (Counter Productive) ثابت ہوگا۔ اٹھنے والا اپنے خیال کے مطابق توظلم کو ختم کرنے کے لئے اٹھے گا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے عظیم تر ظلم ظہور میں آئے گا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۱۵۶)

اوپر کا پورا لمبا اقتباس بے علمی اور بے خبری کی اپنی آپ ایک نادر مثال ہے شرعی احکام کے چار ماخذ ہیں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ مگر اتنا معلوم ہونا کافی نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں سے کس کا کیا مقام ہے اور ان میں کیا ترتیب ہے؟

ورنہ ہوگا یہ کہ **ایک** ہی مسئلہ میں ایک شخص قرآن کو پکڑ کر ایک طرف جائے گا۔ **دوسرا** سنت کو لے کر دوسری طرف، **تیسرا** اجماع اور **چوتھا** قیاس کو لے کر تیسری اور چوتھی طرف جائے گا اس لئے ترتیب کا لحاظ ضروری ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

(الاحزاب:۱)

ترجمہ: اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو حقیقت میں علیم وحکیم تو اللہ ہی ہے۔

یہی بات اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۸ میں بھی کہی گئی ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان:۵۲)

ترجمہ: پس اے نبی! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لیکر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف:۲۸)

ترجمہ: کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط وتفریط پر مبنی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ۔ (سورۂ محمد:۲۶،۲۵)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ جولوگ ہدایت واضح ہوجانے کے بعد اس سے پھر گئے ان کیلئے شیطان نے اس روش کو آسان بنادیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لئے دراز رکھا ہے اسی لئے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہیں مانیں گے اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔

خاص طور سے اس آخری آیت پر غور کیجئے کتنی سخت بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ جولوگ ان کے لئے اپنی اطاعت کا دم بھرتے ہیں جنہوں نے اللہ کی اتاری ہوئی وحی کو ناپسند کیا ہے وہ گویا ارتداد کے مجرم ہیں یہ بھی حکم ان پر لگایا جارہا ہے جو بعض معاملات میں کفار کی بات ماننے اور اطاعت کرنے کی بات کرتے ہیں اس پر ان لوگوں کے انجام کو قیاس کیا جاسکتا ہے جو مجبوری اور اضطرار کی وجہ سے نہیں بلکہ خوش دلی کے ساتھ اور جائز سمجھتے ہوئے کفار و مشرکین کی اطاعت کرتے ہیں۔

پھر ذرا سوچئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے خلاف بغاوت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تابعداری سے انکار کیا، ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرداران قریش کی بات نہ مانی اور اس کی وجہ سے پورے ماحول کا سکون و چین ختم ہوگیا اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے نعوذ باللہ یہ فساد فی الارض تھا؟

ایک عجیب تنقید

برادر محترم لکھتے ہیں کہ

''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک کتاب ''تنقیحات'' ہے۔ اس میں مصنف کے وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جو انہوں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم پر لکھے تھے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب سراسر باطل تہذیب ہے۔ دہریت، الحاد، لامذہبیت اور مادہ پرستی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مذہب کے خلاف عقل و حکمت کی لڑائی نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے (صفحہ ۹) اسلام کے اصول تمدن و تہذیب مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں (صفحہ ۲۵) وہ تخم خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا، چند صدیوں کے اندر تمدن و تہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں۔ جس کے پھول خوش نما مگر خاردار ہیں۔ جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر وہ ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کئے جارہی ہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۲۸-۲۹)

اس قسم کے مضامین صرف جدید تہذیب سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اس بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کے علماء کے لئے یہ تہذیب صرف نفرت و حقارت کا موضوع بن گئی۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے مثبت امکانات کو دریافت کرنے سے قاصر رہے۔ اور اسی لئے وہ اس کو اپنے حق میں استعمال بھی نہ کرسکے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۲۰۳)

اس عبارت کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے مغربی تہذیب کی خوب تعریف کی ہوتی تو مولانا کو برادر محترم باخبر ہونے کا اعزاز دیتے لیکن انہوں نے مغربی تہذیب کو اس کے اپنے رنگ میں پیش کیا اس لئے وہ بے خبری کے طعنہ کے سزاوار ٹھہرے۔ یہ کیسا عجیب معیار تنقید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ایک آیت قرآنی سے غلط استدلال

خان صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن میں ایک آیت معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو جگہ آئی ہے۔ سورۃ البقرۃ ۱۹۳ اور سورۃ الانفال ۳۹۔ آخر الذکر آیت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

ترجمہ: اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لئے ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

فتنہ کے لفظی معنی آزمائش اور ابتلاء ہیں (لسان العرب ۱۳ / ۳۱۷)

صحیح بخاری (کتاب النکاح) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ماترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء (فتح الباری ۹/۴۱)

یعنی میں نے اپنے بعد کوئی آزمائش نہیں چھوڑی جو مردوں کے اوپر عورتوں سے زیادہ ضرر رساں ہو۔

مذکورہ آیت میں فتنہ کا لفظ بھی اسی معنی میں ہے۔ امام حسن بصری تابعیؒ (۲۱-۱۱۰ھ) نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ......

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کا مطلب ہے: حتی لایکون بلاء (تفسیر طبری ۹/۲۴۸) یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ آزمائش کی حالت باقی نہ رہے۔

اس آیت میں فتنہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو مذہبی ایذاء رسانی (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے پوری تاریخ میں مذہب کی آزادی نہ تھی جو طبقہ برسر اقتدار ہوتا وہ اپنے سواء دوسرے مذہب کے لوگوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس سے الگ کسی اور مذہب کو مانیں، یا کسی اور مذہبی طریقہ پر عمل کریں۔

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام جب عرب میں شروع ہوا تو اس وقت وہاں شرک اور مشرکین کا غلبہ

تھا۔انہوں نے پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنایا۔کیوں کہ ان کا عقیدہ مشرکین کے عقیدہ سے مختلف تھا وہ ان کے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر خدا کی عبادت کرتے تھے۔یہ ظلم وستم آخر کار جنگ تک پہنچا۔اس وقت اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے لڑو۔یہاں تک کہ مذہبی جبر کا خاتمہ ہوجائے۔ہر آدمی اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کیلئے آزاد ہوجائے۔

آیت کا دوسرا حصہ: وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ

یہ پہلے حصہ کی مزید وضاحت ہے۔آیت کے پہلے حصہ میں جو بات سلبی انداز میں کہی گئی ہے، اسی بات کو دوسرے حصہ میں ایجابی انداز میں دہرایا گیا ہے۔دوسرے لفظوں میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ.....فتنہ کو ختم کردو، تاکہ عدم فتنہ کی حالت دنیا میں پوری طرح قائم ہوجائے۔

اس آیت میں دین کا لفظ دین شرعی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دین فطری کے معنی میں ہے۔یعنی اس سے مراد وہ دین نہیں ہے جو الفاظ کی صورت میں ہمیں عطا کیا گیا ہے۔اس سے مراد وہ قانون فطرت ہے جو غیر ملفوظ طور پر براہ راست خدا کی طرف سے سارے عالم میں نافذ ہے۔

قرآن میں دین کا لفظ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔مثلاً فرمایا:

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ (النحل:۵۲)

ترجمہ: یعنی خدا ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اسی کے لئے دین ہے (ساری کائنات میں) ہمیشہ، پھر کیا تم اللہ کے سوا کسی اور سے ڈرتے ہو۔

سورہ نحل کی اس آیت میں دین سے مراد وہ دین فطری یا قانون فطری ہے جو بالفعل ساری کائنات میں مستقل طور پر ہر آن قائم ہے۔اس معلوم واقعہ کو بطور شہادت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی قدرت اتنی زیادہ ہے کہ وہ ساری کائنات کو ہر آن ابدی طور پر مسخر کئے ہوئے ہے تو تم کو اسی سے ڈرنا چاہئے، اور اپنی آزادی کو اسی کی ماتحتی کے دائرہ میں استعمال کرنا چاہئے''۔ (فکر اسلامی، صفحہ: ۲۳۵-۲۳۶)

اوپر قرآنی آیت پر برادر محترم کے خیالات آپ نے پڑھ لئے۔یہ آیت چونکہ موصوف کے فکری قلعہ کو بالکل منہدم کر دیتی ہے اس لئے بھرپور زور لگایا ہے آیت کی ایک غلط تفسیر کرنے میں۔

آیت میں حکم قتال کی جو وجہ بتائی جا رہی ہے وہ وجہ بظاہر دو معلوم ہو رہی ہے ایک فتنہ کو ختم کرنے اور دوسرے پورا دین اللہ کے لئے ہونے کے لئے۔لیکن بات ایک ہی ہے جس کا منفی اور مثبت دونوں پہلو کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔اس لئے کہ جب تک فتنہ ختم نہیں ہوگا اس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پورا دین اللہ کے لئے ہوگیا اسی طرح جب تک پورا دین اللہ کے لئے نہ ہوگا اس وقت تک فتنہ کا ختم ہونا نہیں سمجھا جاسکتا۔برادر محترم کے مطابق آج فتنہ ختم ہوگیا ہے اس لئے حکم قتال بھی باقی نہیں رہا۔بالفرض یہ مان لیا جائے کہ فتنہ ختم ہوگیا۔تو کیا

پورا دین اللہ کیلئے ہوگیا ہے۔ یہ مشکل سوال تھا موصوف کیلئے، جس کی وجہ سے انہوں نے دین کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اور فرما دیا کہ اس آیت میں دین کا لفظ دین شرعی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دین فطری کے معنی میں ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ دین فطری یا قانون فطری تو بالکل ساری کائنات میں مستقل طور پر ہر آن قائم ہے اس کیلئے حکم قتال دینے کی ضرورت کیا تھی۔ تکوینی طور پر کائنات کا ذرہ ذرہ حتی کہ کافر اور مشرک بھی مومن اور مسلم ہے۔ تکوینی اسلام کی دعوت لے کر انبیاء نہیں آئے۔ ہمیشہ تشریعی اسلام ان کا موضوع رہا ہے۔

آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے تین سوالوں کا جواب معلوم کیجئے۔

① فتنہ سے کیا مراد ہے؟

② دین سے کیا مراد ہے؟

③ کفار کے باز رہنے کے کیا معنی ہیں؟

ان سوالوں کا جواب ہم عربی مفسرین کے الفاظ میں یہاں دیتے ہیں۔

عربی میں مختصر ترین مشہور تفسیر، تفسیر جلالین ہے جو درس نظامی کا ایک اہم جزء ہے اور عموماً ابتدائی درجات میں پڑھائی جاتی ہے۔

"قاتلوهم حتى لا تكون "توجد "فتنة"، شرك"، ويكون الدين"، العبادة لله وحده لا يعبد سواه "فان انتهوا"، عن الشرك۔

اس عبارت میں تینوں سوالوں کا جواب آ گیا ہے ایک اردو داں بھی سمجھ سکتا ہے۔ ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے، فتنہ کی تفسیر شرک سے، دین کی تفسیر عبادت سے کی گئی ہے پھر کس چیز سے باز آنا ہے بتایا "**عن الشرك**" شرک سے۔

تفسیر القرطبی میں ہے:

هو الأمر بقتال مطلق لا بشرط ان يبدأ الكفار دليل ذلك قوله تعالى "ويكون الدين لله"، وقال عليه السلام امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فدلت الاية والحديث على ان سبب القتال هو الكفر لانه قال حتى لا تكون فتنة، اى كفر الخ۔

یہ مطلق قتال کا حکم ہے اس شرط کے ساتھ نہیں کہ کفار جنگ کی ابتداء کریں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ "**وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ**"، اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں

یہاں تک کہ لوگ لا الہ الا اللہ کہہ دیں پس آیت اور حدیث دونوں سے معلوم ہوا کہ قتال کا سبب ان کا کفر ہے کیونکہ قرآن میں "حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" آیا ہے فِتْنَةٌ یعنی کفر۔

تفسیر روح المعانی میں ہے:

المراد من "الفتنة" الشرک

یعنی فتنہ سے مراد شرک ہے۔

والتقدیر "فان انتهوا" واسلموا

تقدیر کلام یوں ہے پس وہ اگر باز آجائیں اور اسلام قبول کرلیں۔طوالت سے بچنے کے لئے تفسیر امام رازی کا صرف ایک فقرہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

فصار التقدير كانه تعالى قال وقاتلوهم حتى يزول الكفر ويثبت الاسلام.....

پس تقدیر کلام یوں ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ کفر ختم ہوجائے اور اسلام کو ثبات مل جائے۔

مفسرین کی ان تصریحات کے خلاف جانے کی بناء پر برادر محترم کو کئی بے تکی تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے اور یہ کہہ کر تو غضب ڈھادیا کہ دین سے مراد لفظوں میں آیا ہوا دین نہیں ہے۔

